ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مدارس عربیہ کی اہمیت

’’ان مکتبوں (مدرسوں) کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہی مدرسوں میں پڑھنے دو اگر یہ ملاّ اور دُرویش نہ رہے تو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی ۸/سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الخواتین کے نشانات کے سِوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ کے سِوا مسلمانوں کی ۸/سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔‘‘

(علامہ اقبالؒ)

مرکز الإمام أبي الحسن الندوي

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

SEP 12

₹10/-

وارثین انبیاء کا طور طریق

انبیاء کے صحیح جانشین بھی اس بارے میں انہیں کی فراست اور عزیمت رکھتے ہیں، وہ کفر کا ایک ایک نشان مٹاتے ہیں اور جاہلیت کا ایک ایک داغ دھوتے ہیں، کفر کا ادراک کرنے میں ان کی حس عوام سے بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے، کفر جس لباس میں اور جس صورت میں ظاہر ہو وہ اس کو پہچان لیتے ہیں، اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں، کہیں ہندوستان جیسے ملک میں بیواؤں کے نکاح ثانی کو حرام سمجھنے اور اس سے شدید نفرت رکھنے میں ان کو کفر کی بو محسوس ہوتی ہے، اور وہ اس کو رواج دینے اور اس سنت کو زندہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اور بعض اوقات اس پر اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں، کہیں قانون شریعت پر رواج کو ترجیح دینا اور بہنوں کو میراث نہ دینے پر اصرار کرنا ان کو کفر معلوم ہوتا ہے اور وہ ایسے لوگوں کی مخالفت اور ان کا مقاطعہ فرض سمجھتے ہیں، کبھی اللہ و رسول کا صاف و صریح حکم سن لینے کے بعد اس کو نہ ماننا اور غیر الٰہی عدالت اور غیر الٰہی قانون کے دامن میں پناہ لینا اور غیر اسلامی احکام و قوانین نافذ کرنا اُن کو اسلام سے خروج کے مرادف معلوم ہوتا ہے، اور وہ مجبوری کی حالت میں وہاں سے ہجرت کر جاتے ہیں، کبھی کسی نو مسلم کے یا ایسے مسلمانوں کے جو غیر مسلموں کی صحبت میں رہتے ہوں اور ان سے متاثر ہوں، ایسا ذبیحہ استعمال کرنے سے احتراز کرنے میں اور اس سے نفرت کرنے میں جس سے ان کی ہمسایہ قوم اور ابنائے وطن سختی سے مجتنب رہتے ہیں، اور ان میں اس کی نفرت یا اس سے وحشت عام ہے، ان کو ایمان کی کمزوری، اور ان کے قدیم مذہب یا غیر مسلموں کی صحبت کا اثر نظر آتا ہے، کبھی بعض حالات و مقامات میں ایک سنت یا فعل جائز و مستحب کو وہ واجب اور شعار اسلامی سمجھنے لگتے ہیں، کبھی وہ غیر مسلموں کے رسوم و عادات اور ان کی تہذیب اور وضع و لباس اختیار کرنے اور ان سے تشبہ پیدا کرنے کی شد و مد سے مخالفت کرتے ہیں، اور کبھی ان کی مذہبی تقریبات اور تہواروں میں شرکت کی ممانعت کرتے ہیں۔

غرض جاہلیت کی محبت یا اس کی اعانت جس لباس اور جس صورت میں جلوہ گر ہو، اور اس کی روح جس قالب میں بھی ظاہر ہو، وہ اس کو فوراً بھانپ لیتے ہیں، ان کو اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اور اس کی مخالفت کرنے میں کوئی مصلحت ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی۔

ان کے زمانہ کے کوتاہ نظر یا رند مشرب و صلح کل جو دیر و حرم، کعبہ و بت خانہ میں فرق کرنا ہی کفر سمجھتے ہیں، ان کی تضحیک کرتے ہیں اور تحقیر کے ساتھ ان کو فقیہ شہر، محتسب، واعظ تنگ نظر اور ''خدائی فوجدار'' کا لقب دیتے ہیں، لیکن وہ اپنا کام پورے اطمینان و استقلال کے ساتھ کرتے رہتے ہیں، اور کوئی شبہ نہیں کہ پیغمبروں کے دین کی حفاظت ہر زمانے میں انہیں لوگوں نے کی ہے، اور آج اسلام یہودیت و عیسائیت اور برہمنیت سے ممتاز شکل میں جو نظر آتا ہے، وہ انہیں کی ہمت و استقامت اور تفقہ کا نتیجہ ہے۔ جَزَاهُمُ اللهُ عَنِ الْإِسْلَامِ وَوَلِيِّهِ وَنَبِيِّهِ خَيْرَ الْجَزَاءِ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

(علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والا

جلد نمبر ۴ | ستمبر ۲۰۱۲ء - شوال المکرم ۱۴۳۳ھ | شمارہ نمبر ۹

فہرست مضامین

اسلام کے قلعے ۲

بلال عبدالحی حسنی ندوی

اساد اور درس گاہوں کی اصطلاحیں ۴

عبداللہ عباس ندویؒ

نئے تصور اور موقف کی ضرورت ۶

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی

اخلاص کے بغیر علم بے سود ہے ۹

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی

حیض ونفاس کے احکام ۱۱

مفتی راشد حسین ندوی

دین اسلام میں استاد کی عظمت ۱۴

جناب منصور الحق (کراچی)

ایک سلطان کی غریب پروری ۱۶

محمود حسن حسنی ندوی

آپ کے دینی سوالات اور ان کے جوابات ۱۸

یہ برما ہے ۱۹

محمد نفیس خاں ندوی

Dare Arafat Abul Hasan Ali Nadwi Center

دار عرفات

مرکز الامام ابی الحسن الندوی

سرپرست

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

(صدر، دار عرفات)

نگران

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ

(جنرل سکریٹری، دار عرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

فی شمارہ: ۱۰ روپے — سالانہ: ۱۰۰ روپے

www.abulhasanalinadwi.org

Fax: 0535-2211386

Mail: markazulimam@gmail.com

مرکز الامام أبی الحسن الندوي دار عرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی) ۲۲۹۰۰۱

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام ابی الحسن الندوي، دار عرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

اداریہ

اسلام کے قلعے

بلال عبدالحی حسنی ندوی

۱۸۵۷ء کے بعد سے ہندوستان میں مسلمانوں پر انگریزوں کی طرف سے جو ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے اس سے ہر پڑھا لکھا انسان واقف ہے اور ان میں بھی خاص طور پر علماء اور اہل دین کو نشانہ بنایا گیا اور وہ ہزاروں ہزار کی تعداد میں تہ تیغ کر دیے گئے، اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ آزادی کی سب سے پہلی آواز علماء نے اٹھائی، اور آزادی کی لڑائی میں پہلی قیادت علماء نے ہی کی، انگریزوں کے سب سے بڑے حریف مسلمان ہی تھے جن کی قیادت علماء کے ہاتھوں میں تھی، اس وقت صورت حال ایسی پیدا کر دی گئی تھی کہ دین کا تحفظ ایک بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا، دین کے مظاہر کا باقی رکھنا ناممکن سا ہوتا جا رہا تھا، خود مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جس نے دین کو پس پشت ڈال دیا تھا، آہستہ آہستہ خود مسلمانوں میں دین اور اہل دین کی تحقیر کا عمل شروع ہو گیا تھا اور اس ملک میں جس کو مسلمانوں نے ان خون پسینے سے سینچا تھا، اسلام کا وجود خطرہ میں پڑتا نظر آ رہا تھا، اس خطرناک صورت حال کا احساس ہر غیرت مند مسلمان کو تھا اور خاص طور پر علماء نے پوری طرح اس خطرہ کو بھانپ لیا تھا اور اسی کے تدارک کے لیے یہ تدبیر اختیار کی گئی تھی کہ ہر طرح کے سیاسی اور تحریکی اقدامات سے ہٹ کر پوری یکسوئی کے ساتھ ایسے اداروں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا جائے جہاں خالص دینی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہوتا کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ ان اداروں میں رہ کر دین کا حامل بن سکے اور اس طرح تحفظ دین کا جو کام علماء کے ذمہ ہے وہ جاری رہ سکے۔

دار العلوم دیوبند ہو یا دار العلوم ندوۃ العلماء، مظاہر العلوم ہو یا دوسرے دینی ادارے، وہ سب اسی بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر قائم کیے گئے تھے اور یقیناً یہ ان اداروں کے بانیوں کا اخلاص اور قوت عمل کا نتیجہ تھا کہ دین اپنی پوری شان کے ساتھ اس ملک میں باقی رہا، اور آج الحمد للہ ہزاروں دینی ادارے قائم ہیں جو اپنے اپنے دائرہ کار میں مصروف عمل ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جس طاقت اور روح کے ساتھ وہ قدیم ادارے قائم کیے گئے تھے آج عام طور پر اداروں میں اس طاقت کا فقدان نظر آتا ہے اور یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مدارس کی تعداد میں تو سیکڑوں گنا اضافہ ہوتا جا رہا ہے، خوبصورت سے خوبصورت عمارتیں تعمیر کی جا رہی ہیں بلکہ اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا ایک جذبہ ہے لیکن اُس طاقت اور روح کو پیدا کرنے کی فکر خال خال ہی دیکھنے میں آتی ہے جس کے نتیجہ میں علماء ربانیین کی ایک جماعت تیار ہوئی جس نے مسلمانوں کو صحیح رخ پر ڈالنے کی کوششیں کیں اور اصلاح وتجدید کا زبردست کام کیا۔

اس وقت اگر غور کیا جائے تو بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ان مدارس میں اصل مسئلہ نہ وسائل کی کمی کا ہے نہ کوئی بڑا مسئلہ نصاب تعلیم کا ہے، اس وقت سب سے بڑا مسئلہ تربیت کا ہے جس کی عملی شکلیں عام طور پر مدارس میں نظر نہیں آتیں، غیر تربیت یافتہ ذمہ داران، اساتذہ ومعلمین کی وجہ سے مدارس کا حال ابتر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس میں بھی سب سے بڑا مسئلہ اخلاقی تربیت کا ہے، جس کے نتیجہ میں بلند اخلاق، تسامح، ایثار اور سب سے بڑھ کر تعلق مع اللہ کی ایک کیفیت پیدا ہوتی تھی اور یہ بلند صفات اساتذہ و معلمین سے طلبہ کے اندر منتقل ہوتی تھیں اور ایک طالب علم جب مدرسہ سے نکلتا تھا تو وہ نمونہ بن کر نکلتا تھا اور اس کے صلاح و تقویٰ کا معاشرہ پر اثر پڑتا تھا، اس وقت معقولات کے علماء بھی جن کا موضوع براہ راست قرآن وحدیث نہیں ہوتا تھا اپنی ایک زاہدانہ شان رکھتے تھے، مولانا محمد علی رامپوریؒ کا قصہ مشہور ہے جو معقولات ہی کے

بڑے عالم تھے، اور رامپور میں ان کا حلقۂ درس بہت مشہور تھا، انگریزوں نے جب بریلی میں کالج قائم کیا تو ان سے وہاں آنے کی درخواست کی انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا کہ مجھے یہاں تیس روپیہ ملتے ہیں، وہ بند ہو جائیں گے، انگریزوں نے ان کے سامنے تین سو کی پیش گش رکھی، اس پر انہوں نے کہا کہ یہ طلبہ جو مجھ سے یہاں پڑھتے ہیں ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی، انگریز نے پیش کش کی کہ ان سب طلبہ کو بریلی منتقل کر دیا جائے گا اور سب کو وظیفہ دیا جائے گا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ میرے بیری کا ایک درخت ہے میں روزانہ اس کا ناشتہ کرتا ہوں، وہ مجھے کیسے ملے گا؟ اس نے کہا کہ روزانہ اس کے پہنچانے کا انتظام بھی کر دیا جائے گا، آخر میں مولانا نے فرمایا کہ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اگر قیامت میں اللہ نے پوچھا کہ تم ایک جگہ سے دوسری جگہ صرف پیسوں کے خاطر گئے تھے، اس کا کیا جواب دوں گا؟ اس پر انگریز نے کہا کہ اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے اور وہ خاموش ہو گیا۔

آج بھی صورت حال یہ ہے کہ خالص علوم شریعت میں اختصاص کرنے والوں کا مطمح نظر کچھ اور ہوتا ہے، یہ صرف تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہے، اگر چہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں ذمہ داران مدارس کا بھی قصور ہے جن کو مدرسہ کی ٹیپ ٹاپ کی فکر تو ہوتی ہے لیکن اس کے اندر زندگی اور روح پیدا کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر سچی طلب پیدا ہو جاتی ہے تو ایک انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے، آدمی اپنے جان وتن کی بازی لگا دیتا ہے، اور من کی دنیا آباد کرنے کے لیے سب کچھ تج دیتا ہے، بڑی سے بڑی قربانی دے دینا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے، اور طلبہ کے اندر یہ طلب پیدا ہوتی ہے، ان اساتذہ کی فکر وتربیت سے جو اپنے اندر زندگی رکھتے ہیں، ان کے دل امت کے لیے کڑھتے ہیں اور وہ امت کو رجال کار دینے کے لیے ہمہ وقت فکر مند رہتے ہیں، وہ زمانہ کے تقاضوں پر پوری نگاہ رکھتے ہیں لیکن آج علامہ اقبالؒ کا شکوہ ایک حقیقت کی شکل میں نظر آتا ہے کہ ؎

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

مگر یہ شکوہ کافی نہیں ہے، یہ مدارس ہی اسلام کے قلعہ ہیں، یہیں سے مردم سازی کا کام ہوتا ہے اور بقول حضرت مولانا علی میاںؒ یہ وہ پاور ہاؤس ہیں جہاں سے پوری انسانی دنیا میں بجلی سپلائی ہوتی ہے، ان میں کمزوری پیدا ہوئی تو اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوں گے، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ سب مل کر غور کریں اور اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی فکر کریں، مدرسوں کا مالی تعاون کرنے والے اپنے پاک مال کو اس مبارک کام میں لگائیں، مدرسوں میں اپنے بچوں کو پڑھانے والے خاص طور پر ذہین بچوں کو اس کے لیے فارغ کریں، ذمہ داران مدارس کی اصل توجہ مدرسہ کی روح پر ہو اور وہ تعلیم تربیت پر خاص دھیان دیں، اساتذہ طلبہ کو امت کی امانت سمجھیں اور ایک ایک طالب علم کو اس طرح ڈھالنے کی کوشش کریں کہ وہ زمانہ کے خلا کو پر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور ہر ہر طالب علم یہ سوچ کر مدرسہ میں قدم رکھے کہ یہ قربانی کی جگہ ہے یہاں تراش خراش کر ایسے انسان ڈھالے جاتے ہیں جو سراپا روشنی ہوں، ان کے اندر کی ساری کدورتیں نکال دی جائیں، لیکن اس کے لیے زبردست محنت اور جذبہ کی ضرورت ہے، جب ہر طبقہ اپنی اپنی ذمہ داریاں محسوس کرے گا اور ان کی ادائیگی کی سچے دل سے فکر کی جائے گی تو وہ دن دور نہیں کہ پھر امام غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ پیدا ہوں اور اسلام کا باغ پھر سے لہلہانے لگے۔

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ

اسناد اور درس گاہوں کی اصطلاحیں

مدرسہ ایک قدیم اصطلاح تھی، دانش کدہ اور تعلیم گاہوں کے لیے، دنیا کی قدیم درسگاہ اسلامی علوم کے لیے جامعہ زیتونیہ ہے جس کا قدیم نام مدرسہ ہی تھا، اسی طرح الازہر شریف ایک مسجد کا نام ہے اور مسجد کو عربی میں جامع کہتے ہیں، اٹھارہویں صدی کے اخیر میں اس مسجد کے مدرسہ کو یونیورسٹی کی شکل دی گئی، اس وقت سے جامع جامعہ ہو گیا، مدرسہ نظامیہ بغداد، مدرسہ متوکلیہ دمشق، مدرسہ ظاہریہ حلب، مدرسہ ناصریہ مراکش، مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل یہ سب مدرسے تھے، جہاں سے علم وفن کے قابل اعتبار اور قابل حجت علماء نکلے، ہندوستان میں بھی سرسید کا نام جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے، مدرسۃ العلوم ہی تجویز فرمایا تھا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند میں جس درسگاہ کی بنیاد ڈالی وہ بھی مدرسہ کے نام سے موسوم تھی، غرض مدرسہ جس کی اصطلاح اب ختم ہوتی جارہی ہے، اور اس کی جگہ جامعہ کا لفظ استعمال کیا جانے لگا ہے، کوئی معمولی چیز نہ تھی، اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ جامعہ جو ہندوستان کے عربی اور اسلامی مدرسوں کا عمومی لقب بن گیا ہے، اس میں اور ان عصری دانش گاہوں میں جن کو یونیورسٹی کہا جاتا ہے اس کا ترجمہ بھی جامعہ کیا جاتا ہے، جامعہ لکھنؤ اور جامعہ میں کیا فرق ہے؟ یہ سوال میرے لیے اس وقت بھی الجھن کا باعث ہوتا تھا جب عرب ممالک میں اسناد کے معادلہ کی بات ہوتی اور لوگوں کو جامعہ علی گڑھ اور کسی عربی مدرسہ کے درمیان فرق کرکے بتانا ہوتا، عام طور پر یہ سمجھا جاتا کہ حکومت وقت کی سرکردگی میں چلنے والے ادارے یونیورسٹی یا جامعہ عصریہ یا حکومیہ کہہ کر ممتاز کیے جاتے اور مدارس اسلامیہ جنہوں نے اپنے آپ کو مدرسہ کے بجائے جامعہ کہلانا پسند کیا ہے، ان کو شعبیہ اہلیہ کہہ کر جان چھڑائی جاتی، زبان میں ہمیشہ وسعت ہوتی رہتی ہے، اصطلاحات بدلتی رہتی ہیں، اس لیے اگر اہل مدارس اپنی درسگاہوں کو جامعہ کہیں تو اس میں کوئی لسانی، شرعی یا قانونی قباحت نہیں، اصطلاحات میں توسع ضرب المثل ہے، لیکن ان حضرات کے لیے جن کے ذہن میں ان اُسماء اور مسمیات کا فرق نہیں ہے ان کے لیے تعریفی اصطلاحات کے طور پر حسب ذیل تشریحات انشاء اللہ مفید ہوں گی:

(۱) یونیورسٹی یا اس کا ترجمہ جامعہ اس ادارہ کو کہتے ہیں جو مختلف کالجوں کا جامع ہو اور ہر کالج اپنی جگہ پر ایک اکائی ہو جس کا انتظامیہ تعطیلات کا نظم، تعلیم کے اوقات، کسی کے پابند نہ ہوں، طلبہ کا یونیفارم بھی مختلف ہوتا ہے، اور یہ سب اپنی ڈگریاں جس ادارے سے حاصل کرتے ہیں اس کو یونیورسٹی کہتے ہیں، اگر کسی خاص فن کی تعلیم کا ادارہ ہے تو اس کو انسٹی ٹیوٹ (Institute) کہا جاتا ہے جس کا ترجمہ بلاسبب معہد کیا جارہا ہے۔

(۲) اسکول ہندوستان میں ثانوی مدرسے یا اس سے نیچے پرائمری درجات کی تعلیم گاہ کو کہتے ہیں، اس کا ربط جامعہ سے نہیں ہوتا ہے، ان اسکولوں سے نکلنے والے طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جب کسی کالج کا رخ کرتے ہیں تو ان کا وہ کالج کسی یونیورسٹی سے مربوط ہوتا ہے، یورپ میں اسکول بڑی اہمیت رکھتا ہے، وہ انسٹی ٹیوٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور بسا اوقات اس کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ اگر فن یا ایک صنعت کے لیے انسٹی ٹیوٹ ہے تو اسکول ایک شعبہ سے متعلق مضامین پڑھانے اور اس پر ریسرچ کرنے کے انتظام کرتا ہے، جیسے لندن یونیورسٹی میں (School of Oriental and

African Studies) ہے، جس میں مشرقی ممالک کی زبانیں، مذاہب کلچر وغیرہ کی تعلیم بھی ہوتی ہے اوران پر ریسرچ کرکے اسی اسکول کے راستہ سے لوگ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرتے ہیں، جس پر مہر بہرحال ''جامعہ لندن'' ہی کی ہوتی ہے، اسی طرح ہارورڈ یونیورسٹی (Harward University)، کیلیفارنیا یونیورسٹی (California University) میں ترتیب یہ ہے کہ انسٹی ٹیوٹ سے فارغ ہونے والے ڈپلوما پاتے ہیں اور اسکول سے نکلنے والے اعلیٰ ڈگریاں اپنی متعلقہ یونیورسٹی سے پاتے ہیں۔ رہائشی یونیورسٹیاں، یو کے کالج سب ایک ہی کمپس مین ہیں، وہاں کالجوں کے بجائے فیکلٹی (Faculty) کی اصطلاح ہے، اگر یہی فیکلٹی کسی دوسرے شہر میں ہو یا یونیورسٹی کے انتظامیہ سے براہ راست متعلق نہ ہو تو وہ کالج کہے جائیں گے، تعلیم کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ بچہ پانچ سال کی عمر میں مدرسہ جانا شروع کرتا ہے، اس سے کچھ کم عمر کے بچے صنعتی ملکوں میں کنگ گارڈن، نرسری اسکول وغیرہ میں رکھے جاتے ہیں، ابتدائی کے عموماً چھ سال ہوتے ہیں جس کے مختلف نام ہیں، گیارہ سال کی عمر کی بعد لڑکا مزید چھ سال ثانوی تعلیم حاصل کرتا ہے، اس کو کالج میں داخل ہونے کے لائق بن جانے کی سرٹیفکیٹ دی جاتی ہے، ہندوستان میں پہلے ثانوی اسکول کی اختتامی سرٹیفکیٹ کو انٹرنس سرٹیفکیٹ کہا جاتا تھا، یعنی اب وہ کالج میں داخل ہو گیا، کالج میں مضامین زیادہ سے زیادہ چھ اور کم سے کم چار ہوتے ہیں جس میں مقامی (ورناکولر) اور سرکاری زبان بھی داخل ہے، اسی چار سالہ مرحلہ کو پاس کرنے والے فارغ التحصیل سمجھے جاتے ہیں، ان کو جو ڈگری دی جاتی ہے اس کو بیچلر کہا جاتا ہے، اس کے لفظی معنی صرف کنوارا ہونے کے نہیں ہے، بلکہ پختہ کار مرد بالغ العمر جوان کے بھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ شہری ہونے کے لحاظ سے ہر قسم کی ذمہ داری قبول کرسکتا ہے، فرنچ میں اس کو ''بکالیورس'' کہتے ہیں، پھر جب سے ادبیات اور سائنس کی تعلیم میں وسعت ہوئی تو ادبیات کے فارغ کو لیسانس (یا انگریزی میں بی اے کہنے لگے) اور سائنس کے لائن سے نکلنے والوں کو بکالیورس اور انگریزی میں بی ایس سی کہا جانے لگا۔

اس مرحلہ کے بعد کسی ایک خاص موضوع پر کوئی شخص ماہرانہ دسترس حاصل کرنا چاہے تو اگر وہ اپنی صلاحیت کے اظہار مقالہ کے ذریعہ کرے تو ماسٹر آف فلاسفی (ایم فل) کی ڈگری پاتا ہے اور اگر زبان اور تحریری امتحان دے کر اپنا حق تسلیم کرائے تو اس کو ماسٹر آف آرٹ (M.A.) یا ماسٹر آف سائنس (MSc) کا درجہ ملے گا، ہندوستان میں ایم اے کے بعد ایم فل کرایا جاتا ہے، جیسے یورپ کی یونیورسٹیز میں ایم اے کے بعد اس فن مین ڈپلوما کراتے ہیں، ہر جگہ کا اپنا علیحدہ پروگرام ہے، کہیں بی اے آنرس کے بعد ہی اجازت دی جاتی ہے، اس مرحلہ کے ساتھ یا اس کے بعد اور کبھی کبھی اس سے پہلے بھی کسی ایک فن کے کسی خاص نقطہ پر کوئی ایسی تحقیق کرے جس کو یہ کہا جائے کہ اس نے اس فن میں اضافہ کیا تو اس کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے کسی خاص گوشہ کی فلاسفی میں کسی اضافہ کے باعث ہوا ہے، Ph.D کا مطلب ہے:

"To produce something new, certain academic field".

اہل ایران ڈاکٹر کا ترجمہ ''علیم'' کرتے ہیں، اصطلاح کی بات اور ہے، ورنہ یہ درحقیقت پہ کوئی ترجمہ نہیں ہوا، عربوں نے اس کو کوئی بدل تلاش نہیں کیا اور نہ مشرقی زبانوں میں کوئی مناسب لفظ سنا گیا۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ ہمارے مدارس اب مدرسہ کے لفظ کو کثرت سے ترک کررہے ہیں اور اپنی درسگاہوں کو جامعہ کہلانا پسند کرتے ہیں۔ اصطلاح کی حد تک ان کا حق ہے کہ جو لفظ بھی چاہیں اور جو نام بھی چاہیں رکھ لیں، لیکن فنی لحاظ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ مدرسے جہاں صرف دین اسلام کی تعلیم ہوتی ہے...

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی

نئے تصور اور موقف کی ضرورت

مسلمانوں کی علمی تاریخ، جدت، تخلیق وندرت آفرینی سے معمور ہے، اپنے عہد زریں میں مسلماں علم وفکر کے خوشہ چیں، بحث وتحقیق کے شیدائی وفدائی اور اس کے افق کو وسیع سے وسیع تر کرنے والے تھے، حکمت ودانائی کی تلاش، علم ومعرفت کے جدید میدانوں کی جستجو، دقت نظر، دیدہ ریزی اور اپنے اسلاف کی تحقیقات میں اضافہ اور نئے گوشہ تلاش کرنے والے تھے، دقیقہ سنجی ان کا طرۂ امتیاز تھی، اہل علم اپنے پیشرو محققین کی علمی تحقیقات پر اکتفا نہیں کر لیتے تھے، بلکہ ان کی تصنیفات وتحریروں کا آزادانہ تجزیہ، ان کی تحقیقات وطرز تفکیر پر نقد وجرح بھی کرتے تھے، وہ نہ اندھی تقلید اور نقل محض کے قائل تھے، اور نہ اسلاف کے خیال کی ہر تحقیق کو حرف آخر سمجھنے والے، اس کے باوجود وہ اپنے اسلاف کی وسعت علم، فکری گیرائی وگہرائی اور اکتساب علم کی راہ میں ان کی قربانیوں وجانفشانیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے تھے، اور درحقیقت یہی اسلاف کے کمال کا اعتراف ان کی کامیابی اور علمی تفوق کا راز ہے۔

تاریخ نے بحث وتحقیق کے میدان میں چند ایسی شخصیتوں کو جنم دیا ہے جنہوں نے نہ صرف معاصر علوم وفنون میں کمال پیدا کیا، بلکہ اس کے ساتھ انہوں نے علوم وفنون کو مزید وسعت دی اور فکر وفن کے نئے گوشوں کو اجاگر کیا، ان میں ابن رشد، ابن حزم، ابن الہیثم، رازی، البیرونی، ابن سینا، ابن خلدون اور دیگر حکماء کے نام تاریخ کے افق پر جگمگا رہے ہیں، جنہوں نے ان علماء کی آراء، فلسفوں اور خیالات کو جو علمی وفکری تحقیق کا نتیجہ تھے، تنقید کی کسوٹی پر رکھ کر اپنے اصول وپیمانوں کے مطابق پرکھا، انہوں نے اپنے اس موقف سے علمی سرمایہ میں اضافہ کیا، اپنی کوششوں وکاوشوں سے علمی خزانہ میں اضافہ کیا، اور علم وفکر کے افق کو وسعت دی، زمانہ کی ذہنیت ومزاج کے مطالعہ نے انہیں اپنے زمانہ سے نہایت قریب، اور اس سے گہرا لگاؤ پیدا کر دیا تھا، اس طرح کاروان علم نہایت تیز گامی سے بڑھتا اور پھلتا پھولتا رہا، اور مسلمان علم کے تمام فنون اور اسلامی، یونانی، فکری، علمی اور تجرباتی میدانوں میں ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔

''تاریخ الفلسفۃ فی الاسلام'' کا مصنف دی بور کہتا ہے کہ: قدیم عرب مورخین جزئیات تک کے ادراک میں کمال رکھتے تھے، اسلامی سلطنت کے وسیع ہوجانے کی بناء پر انہیں تاریخ اور جغرافیہ میں اچھا خاصا مواد دستیاب ہوگیا تھا، ہارون رشید کے زمانہ میں ہندوستان، چین اور سری لنکا میں مسلمانوں کے بکثرت اسفار بھی ہوئے ہیں۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بحری راستہ سے کوریا پہنچے، اسی طرح اسلامی فتوحات کا ایشیا کے وسطی ملکوں ہندوستان، شمال افریقہ اور یورپ پر بہت اثر پڑا، ان ملکوں میں اسلامی فکر کو پھیلانے اور ان کے اقتصادی سیاسی اور اجتماعی حالات کو بہتر بنانے اور تجارتی وصنعتی سرگرمیوں کو مزید فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا، اس سلسلہ میں ان خرداذبہ کی کتاب ''المسالک والممالک'' ایک رہبر ورہنما کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے مسافر کو دجلہ سے لے کر ہندوستان وچین پہنچنے والے بحری راستوں کو اختیار کرنے میں مدد ملتی ہے۔

مسلمانوں نے اس زمانہ میں فن طب پر بھی عبور حاصل کیا، مریضوں کے علاج ومعالجہ کے سلسلہ میں ان کا اعتماد حاصل شدہ تجربات پر تھا۔

فلسفہ میں مسلمانوں کے اندر بہت سے علماء وحکماء پیدا ہوئے، انہوں نے ایک طرف علماء یونان کے غلط نظریات کی نشاندہی واصلاح کی تو دوسری طرف فلسفہ کی تشکیل جدید کا بیڑا اٹھایا، متعدد علماء نے ارسطو کے بعض افکار پر تنقید کی، فلسفہ میں ابن سینا، غزالی، ابن رشد کے افکار وخیالات آج تک مستقل طور سے بحث وتحقیق اور فکر ومطالعہ کا موضوع بنے ہوئے ہیں، ابن سینا اور ابن خلدون

نے اپنے زمانہ میں ان کو اپنا موضوع بنایا، جو بعد کے بہت سے یورپین فلسفیوں کی تحقیق کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عربوں نے شام وممالک فارس میں اپنی شوکت وحشمت کے پرچم لہرانے کے بعد فن تعمیر کے میدان میں ایک خاص طرز اپنایا جوان کے معیار زندگی کے عین موافق تھا، ان کی عمارتیں خاص طرز کی حامل تھیں جو اپنا مخصوص انداز رکھتی تھیں، اسلامی فن تعمیر اپنی خصوصیات کے ساتھ بیرونی طرز تعمیر سے استفادہ کے باوجود برقرار وباقی رہا، شریف ادریسی سب سے پہلا وہ مسلم جغرافیہ داں ہے جو تین صدی تک یورپ کا استاذ بنا رہا۔

اس وقت یورپ کے پاس دنیا کے حالات معلوم کرنے کا ادریسی کی وضع کردہ معلومات کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں تھا، اس فن میں وہ علوم عرب کا خلاصہ سمجھا جاتا ہے، اس سلسلہ میں بطلیموس نے جو غلطیاں کی ہیں ادریسی ان سے محفوظ رہا۔

سارٹیو رقمطراز ہے کہ: ''اسلامی تہذیب نے سائنس بالخصوص تجرباتی یا تطبیقی علوم کے میدان میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ بازنطینی مملکت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔

اسلامی تہذیب نے تمام علوم وفنون کو پروان چڑھایا، اور ان میں چار چاند لگائے، انہیں حسن وکمال کی آخری منزل تک پہونچایا، اور اپنے رجحانات ونظریات سے یونانی علوم وفنون کی تمام قسموں کو مالا مال کر دیا، الجبراء، ریاضی، طب، کیمیا، طبعیات، فلکیات، علم المساحت، معدنیات جیسے علوم کی خدمت کی، اور ان تمام موضوعات پر کتابوں کا ایک عظیم الشان ذخیرہ چھوڑا اور بہت سی عظیم الشان شخصیتیں معرض وجود میں آئیں، شعراء، مورخین اور فلسفی پیدا ہوئے۔

یونانی وسریانی زبانوں سے جو علوم عربی میں منتقل کیے گئے ان کے زبردست اثرات اسلامی تہذیب پر پڑے جو نسبتا بازنطینی تمدن سے کہیں زیادہ تھے، اس طرح اسلامی تہذیب قرون وسطی میں یورپین اور مشرقی یونانی دونوں تہذیبوں وتمدنوں کے درمیان اہم مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔

لیکن یہ صورتحال زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہ سکی، علمی میدان میں ترقی وعروج، علمی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور اس کے سرمایہ کو نت نئی تحقیقات سے مالا مال کرنے اور اس کے افق کو وسیع سے وسیع کرنے کی سرگرمی سیاسی افراتفری کے دور میں رک گئی جس سے عالم اسلام دوچار تھا، نتیجتاً علماء کی کوششیں سابق اہل علم کی تحقیقات تک محدود ہو کر رہ گئیں، انہوں نے ان کی تشریح وتلخیص پر اکتفاء کیا۔

مسلمانوں کو اسی دور میں دو زبردست ہزیمتوں کا شکار ہونا پڑا، پہلا حادثہ سقوط بغداد کا ہے جس میں بے شمار جانی ومالی اور علمی نقصانات ہوئے، کبھی تو دجلہ وفرات کی نہریں کتابوں کی روشنائی سے سیاہ ہو گئیں اور کبھی مسلمانوں کے خون سے سرخ، پھر سقوط اندلس کا واقعہ پیش آیا جو مسلمانوں کے لیے بیک وقت علمی وجانی کشت وخونریزی کا سبب بنا، اس کے بعد شام ومصر پر مسلسل صلیبی حملوں نے مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کو فنا اور علمی خزانہ کو منتشر وضائع کر ڈالا۔

عثمانی اقتدار مکمل طور سے جنگی محاذ آرائی کا دور رہا، سلاطین کی ساری توجہات، اسلام دوستی، علم نوازی وعلماء پروری کے باوجود سلطنت کے استحکام اور اس کی توسیع پر مرکوز رہیں، پھر سامراج آیا اور اس نے مسلمانوں کے علمی اصولوں کو ڈھانے کو اپنا مقصد بنایا، سامراجیوں نے ساری کوششیں عالم اسلام سے علوم وفنون کو منتقل کر کے یورپ کی لائبریریوں کی زینت بنانے میں صرف کر ڈالیں، مغرب کے علماء اور مشنریوں نے ان علمی سرمایوں کو منتقل کرنے، ذاتی مکتبوں کو اپنی تحویل میں لینے اور ان پر قبضہ کرنے کا کام نہایت چابکدستی سے انجام دیا، مسلمان اس وقت کرب واضطراب کے عالم میں تھے، عدم تحفظ کا احساس انہیں ہر لحہ دامن گیر تھا، ان کی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، ایسے پر آشوب دور میں اپنی جائیدادوں اور مکتبوں کی حفاظت وہ کیسے کرتے؟ چنانچہ بہت سے علم دوستوں کو اپنے علمی خزانوں سے دستبردار ہونا پڑا، وہ انہیں حقیر قیمت پر فروخت کرنے پر مجبور ہوئے، اس کے بعد سامراجیوں نے جب اسلامی دانشگاہوں، اداروں نیز شرفاء اور معززین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے فنی شاہکاروں، نادر شہ پاروں، بیش قیمت مخطوطات ومطبوعات اور بیش بہا علمی وفنی گہر پاروں کو اپنے ملک میں منتقل کر لیا اور جو بچا کھچا رہ گیا تھا اسے نذر آتش کر ڈالا یا وہ ان افراد کے پاس چلا گیا جو بالکل اس کے ناقدر شناس تھے، مسلمانوں کے تمام علمی مراکز میں اس قسم کے علمی خزانوں کو ہضم کر لینے یا ضائع

کردینے کے واقعات تاریخ میں متعدد بار پیش آئے ہیں، جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، اور یہی بیش قیمت موتی وگوہر آج تک برطانوی تاج، برطانوی امراء اور برطانوی میوزیم کی زینت بنے ہوئے ہیں، اسی طرح بیشمار مراجع وماخذ اور دستاویزات بھی مسلمانوں کے عہد کی یادگار ہیں جن کا مشاہدہ سامراجی ملکوں کے میوزیموں میں ہر شخص کرسکتا ہے۔

اس بیش بہا سرمایہ کے ضائع ہوجانے اور ان علوم کی زبانوں سے لوگوں کی بے تعلقی ودوری کے نتیجہ اور نئی نسل کا ان کو نہ سمجھ سکنے کے خدشہ کی وجہ سے صلیبی جنگوں اور یورپین سامراج کے دور کے مسلم علماء باقی ماندہ علمی ذخیرہ کو محفوظ کرنے اور اس کی شرح وتعلیق، تلخیص وتنقیح کے کام میں لگ گئے تاکہ یہ علوم محفوظ رہ سکیں، اسی چیز نے مسلمانوں کے اندر نقل اور علمی تقلید کے مزاج کو جنم دیا، اس طرح علم کی رفتار سست، اور اس کارواں دواں قافلہ سست گام ہوگیا۔

آج صورتحال بدل چکی ہے، عالم اسلام کے اکثر ممالک آزاد ہوچکے ہیں، تاہم بہت سے ملکوں میں خاص سیاسی حالات یا سامراجی ملکوں کے اثرات کی وجہ سے بہت سی پابندیاں وبندشیں بھی ہیں، اس لیے مسلمان جسمانی طور پر آزاد ہونے کے باوجود فکری طور پر آزاد نہیں ہیں، بلکہ محکوم ومقید ہیں، عالم اسلام کے آزاد ہوجانے کا تقاضہ تو یہ تھا کہ وہ علم ومعرفت کے میدان میں بھی خود کفیل ہوجاتا، لیکن یورپ کے علمی سرچشموں پر تکیہ کرلینے کی روش اس سے نہ چھوٹی، مسلم رہنماؤں نے علمی میدان میں ترقی کرنے کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا، اور نہ ہی اپنی علمی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے کوشش کی، بلکہ وہ مغرب کے سرچشموں سے فیضیاب ہونے پر قناعت کرتے رہے۔

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ متعدد اسلامی ملکوں میں ادھر اخیر کے چند سالوں کے اندر کئی علمی وادبی اکیڈمیاں قائم ہوئیں۔

اسی طرح تمام جغرافیائی حدود وقیود سے قطع نظر اسلامی موضوعات پر ریسرچ وتحقیق کی غرض سے جدید اکیڈمیوں کی بنیاد ڈالی گئی ہیں جو زبان وادب اور فن پر خاص توجہ دے رہی ہیں، اور لسانی وعلمی اغراض ومقاصد کی تکمیل کررہی ہیں۔

بقیہ: اسناد اور درسگاہوں کی اصطلاحیں

اور اس سے متعلقہ فنون پڑھائے جاتے ہیں، وہ ایک انسٹی ٹیوٹ کہے جاسکتے ہیں اگر ان کے اندر ادب، قرآن، حدیث، فقہ، منطق کی تعلیم کا انتظام ہے، جب بھی یہ سب اپنی جگہ پر اکائیاں نہیں ہیں بلکہ ایک دھاگہ میں پروئی ہوئی موتیاں ہیں اور ایک انتظامیہ کے ماتحت ان تمام علوم کی تعلیم دی جاتی ہیں، صحیح تعریف کے لحاظ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی جامعہ نہیں ہے اگرچہ اس کی پچاس شاخیں ہیں، لیکن جب تک پچاس شاخوں میں مختلف علوم وفنون پڑھانے کا انتظام نہ ہو اور دوسری جگہ پڑھنے والے سند یہاں سے پاتے ہوں اس وقت تک اس کو جامعہ کہنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ایک درجہ غلط العموم کی پیروی بلکہ ایک حد تک احساس کہتری کی دلیل بھی ہے، ندوہ کے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ ہندوستان میں دارالعلوم کا لفظ اسی نے ۱۹۱۱ء میں متعارف کرایا اور یہ لفظ بھی ایک وسیع انسٹی ٹیوٹ یا زیادہ سے زیادہ کالج کا ہم معنی ہے، غالباً الازہر اور جامعہ قاہرہ کے درمیان جو دارالعلوم ہے اور جہاں قرآن اور زبان کی تعلیم پر زیادہ اعتناء برتا جاتا تھا، وہ یہاں کے بزرگوں کے پیش نظر ہوگا، لیکن بلکہ عجیب بات یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ لوگ مدرسہ کو چھوٹا اور حقیر سمجھ کر ناقابل التفات سمجھتے ہیں اور اپنی درسگاہ کو مدرسہ کہنا شاید ازالہ حیثیت عرفی سمجھتے ہوں لیکن یہ جامعہ کے ساتھ دارالعلوم کا مرکب استعمال کرنے لگے ہیں، مثلاً کوئی کہے انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی، یا اسکول یونیورسٹی، ظاہر ہے کہ یا تو ایک ادارہ اسکول ہے یا یونیورسٹی، بہرحال اس طرح کے غلط العموم مفاہیم کی تصحیح سے مقصود کسی کی توہین نہیں ہے، اور نہ ناواقفیت کا الزام لگانا ہے، البتہ ان دوستوں سے جو کوئی دینی تعلیم کے لیے ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں ان سے ضرور کہوں گا کہ واقفیت کے بعد سمجھ بوجھ کر کوئی نام پسند کریں، کوئی اپنے کو جامعہ کہے، کوئی دارالعلوم اور کوئی دانشکدہ ع

تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے میخانے کا نام

مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی

اخلاص کے بغیر علم بے سود ہے

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ علمی میدان میں نیت کا بہت بڑا دخل ہے، اس لیے کہ اصل علم معرفت کے لیے ہوتا ہے، دنیا حاصل کرنے کے لیے، شہرت اور ناموری حاصل کرنے کے لیے نہیں ہوتا، تو آپ یہ سمجھ لیں کہ علم کے دو کنارے ہیں، ایک کا تعلق اوپر سے ہے جس سے معرفت کی کھڑکیاں کھلتی ہیں جس کے بارے میں حضور پاک علیہ الصلوات والتسلیم نے فرمایا تھا "إنی أعلمکم باللہ" میں سب سے بڑا علم والا ہوں، اسی وجہ سے اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں اور اللہ کا سب سے زیادہ لحاظ رکھنے والا ہوں، اسی طرف قرآن میں اشارہ ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ یعنی اللہ کے بندوں میں علماء ہی سب سے زیادہ اللہ کی خشیت والے ہیں۔

اصل علم خشیت پیدا کرتا ہے، گویا کہ اللہ سے وابستگی پیدا کرتا ہے اور معرفت کی کھڑکیاں کھولتا ہے، علم والا خود روشنی ہوتا ہے، اس کو اوپر سے روشنی ملتی ہے اور دوسروں کو روشن کرتا ہے، اسی لیے جب قرآن کی پہلی آیت جو نازل ہوئی اس میں اس کی طرف اشارہ ہے: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ☆ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ☆ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ☆ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ☆ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ اس میں پڑھنے کا حکم ہے لیکن اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کے سایے میں، تو وہ علم برکت والا ہوگا اور اس سے خوشبو آئے گی اور اس کا ایک مزہ آئے گا اور اس کی ایک لذت بھی ہوگی اور اس کی ایک روشنی ہوگی، اس میں ہدایت کے پھول ہوں گے جس کی خوشبو وہ محسوس کرے گا، اس میں جتنا اللہ سے تعلق ہوگا اتنا علم کی روشنی سے اللہ کی معرفت سے وابستہ ہوتا جائے گا، اور اگر علم کا استعمال دنیا کے لیے کر رہا ہے، جاہ وحشم کے لیے کر رہا ہے شہرت و ناموری کے لیے کر رہا ہے اور لوگوں کی تعریف سننے کے لیے کر رہا ہے تو یہ علم اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے گا اور اس علم میں برکت کجا بدبو ہوگی اور اس سے خیر کے بجائے شر پھیلے گا اور بے برکتی عام ہوگی، بجائے یہ کہ اس سے لوگ ترقی کریں وہ اس کے برخلاف ہوگا، آپ اس کے علم سے اور نقصان اٹھائیں گے اور غلط راستہ پر جائیں گے۔

یہ بہت دھیان کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ کے لیے علم حاصل کیا جائے اور اللہ ہی کے لیے دوسروں تک پہنچایا جائے، اس میں کسی طرح کی غرض شامل نہ ہو، اگر اس میں غرض شامل ہوگی تو سارا علم ملیامیٹ ہو جائے گا یعنی اگر یہ ذہن میں ہے کہ یہ بہت بڑے عالم ہیں، علامہ ہیں، صاحب تصنیفات ہیں، بڑے بڑے نکتے بیان کرتے ہیں، ماشاء اللہ صاحب تصنیفات ہیں، ان کے مضامین پرچے میں چھپتے ہیں، ان کی تقریریں ریڈیو میں نشر ہوتی ہیں، اور لوگ ان سے بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ان کا ہر طرف چرچہ ہے، تو حدیث میں آتا ہے کہ ایسے شخص کو آخرت میں بلایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تمہیں دنیا میں علامہ کہا جا چکا۔ اور پھر ایسے شخص کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا کہ تمہیں دنیا میں علامہ کہا جا چکا، اسی لیے ہمارے علماء ہمیشہ اس میں بہت زیادہ محتاط رہے ہیں۔

ہمارے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کتنے بڑے عالم ہیں، اللہ نے انہیں کتنا بڑا مقام عطا کیا ہے، یہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے، یہ تو علم کے پہاڑ تھے لیکن اس کے باوجود تواضع کا اتنا غلبہ تھا کہ کبھی بھی اپنے بڑے ہونے کا فخر نہیں تھا یہاں تک

کہ ان کا واقعہ لکھا ہوا ہے کہ ایک مرتبہ بازار میں جارہے تھے تو ایک شخص گٹھر اٹھائے ہوئے تھا، اس نے آپ کو سمجھا کہ آپ مزدور ہیں، وہ گٹھر اس سے اٹھ نہیں رہا تھا، اس نے مولانا سے کہا ارے یہ گٹھر ہے اسے اٹھاؤ گے، میں اس کی مزدوری دے دوں گا، مولانا نے کہا ہاں ہاں کیوں نہیں، اس شخص نے وہ گٹھر ان کے سر پر رکھ دیا، جب وہ دیوبند قصبہ پہنچے تو وہاں تو لوگ مولانا کو پہچانتے تھے، گدڑی کا لعل لعل ہوتا ہے، وہ چمکتا ہے، ہیرا دور سے چمکتا رہتا ہے تو لوگ دوڑے کہ یہ تم نے کیا حرکت مولانا کے ساتھ کی، لوگ اسے برا بھلا کہنے لگے، تو مولانا نے کہا اسے کچھ نہ کہو، یہ گٹھر اس سے نہیں اٹھ رہا تھا، تو میں نے اٹھالیا۔ تو مولانا اس قدر متواضع تھے۔

آج کا حال تو یہ ہے کہ ذرا علم آجاتا ہے تو اپنا کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتے، حالاں کہ اولین و آخرین کے علم کے امام سید الاولین والآخرین جناب حضور پاک ﷺ کے بارے میں کیا آتا ہے: "کان یخدم لنفسه" اپنا کام خود کرتے تھے، اپنے کپڑے دھو لیتے تھے، دودھ بھی دوہ لیتے تھے، لیکن آج کل علم والوں کا حال بگڑ گیا ہے، اسی طرح مولانا کا حال یہ بھی تھا کہ خاص طور پر اگر کوئی مولانا کو پیچھے سے کہتا "مولانا" تو مولانا اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتے تھے، اور اگر کوئی کہتا "قاسم" تو ایک دم مڑ کر دیکھتے تھے، کہتے تھے میں تو قاسم ہوں مولانا کہاں، مولانا تو کوئی اور ہوگا۔ لیکن آج کل لوگ اپنے قلم سے مولانا، مفتی لکھتے ہیں، جب بھی لکھیں گے تو اپنے ہاتھ سے لکھیں گے کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ ماشاء اللہ مولانا بھی ہیں مفتی بھی ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہیں! یہ تو آج فرق ہوگیا ہے کہ ہمارے حضرت مولانا کے والد مولانا عبد الحی صاحبؒ کتنے بڑے عالم اور کتنی بڑی بڑی کتابوں کے مصنف ہیں، وہ اپنی پوری زندگی کتابیں لکھتے رہے اور اپنے ساتھیوں سے بھی نہیں بتایا اور آپ اپنا کام کرتے رہتے تھے لیکن جب ان کے انتقال کے بعد ان کے مسودہ کا بکس نکالا گیا تو پتہ چلا لیکن آج کل کتابیں لکھتے کم ہیں اور شہرت زیادہ کرتے ہیں، اس لیے یہ چیز بے برکت ہوگئی ہے، یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ میں کتنی کتابوں کا مصنف ہوں، میں اتنے لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں، ظاہر ہے کہ کوئی غرض سے کر رہا ہے، کوئی ڈگری کے لیے کر رہا ہے تاکہ اس ڈگری سے کوئی اعلی عہدہ مل جائے، اونچا مقام حاصل ہوجائے، اور کوئی اپنی شہرت کے لیے کر رہا ہے، اپنی تصنیفات کو چمکانے کے لیے کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا کہ تمھیں علامہ، محدث، فقیہ کہا جاچکا، تو یہ کتنی خطرناک بات ہے!!

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ میں نے کہا کہ علم کے دو رخ ہیں، ایک اوپر جاتا ہے تو اس کے اندر خوشبو پیدا ہوجاتی ہے اور جب یہ نیچے جاتا ہے تو بدبو پیدا ہوجاتی ہے، آپ دیکھئے کہ انسان کے اندر اللہ نے پیٹ میں ایسا نظام رکھا ہے جب ریاح ڈکار کی شکل اختیار کرتی ہے تو وہ اوپر آتی ہے، اور اگر معدہ خراب نہ ہو تو ڈکار صحیح ہوتی ہے، اس میں اچھے کھانے کی خوشبو ہوگی، اور ڈکار جب نیچے جائے گی تو آج تک کسی کی ریاح میں خوشبو نہیں ہے بدبو ہی بدبو ہے، یہاں بھی ایسا ہی معاملہ ہے کہ جب یہ علم اوپر جائے گا تو اس کا تعلق اللہ سے مضبوط ہوگا اور یہ علم خوشبو والا ہوگا، برکت والا ہوگا، جب یہ نیچے جائے گا تو یہ بے برکت ہوگا، اسی لیے آج کل پڑھے لکھے لوگوں کے اندر برکت نہیں ہے، کہنے کے تو بڑے بڑے صاحبان تصنیف، صاحبان تقریر، صاحبان تحریر، ارباب قلم، بہت کچھ ہیں، لیکن ان میں سے کسی کے قلم سے فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے، ہمارے امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ بہت سے صاحب تصنیف ایسے ہیں جو کاغذ کو سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں، نہ جانے انہوں نے کتنے کاغذ سیاہ کر ڈالے لیکن اس کا ذرا بھی کسی کو فائدہ نہیں پہنچا، اور بعض اللہ کے وہ بندے ہیں جو ایک جملہ کہہ دیتے ہیں اور وہ لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے...

(بقیہ صفحہ ۱۷ پر)

مفتی راشد حسین ندوی

حیض ونفاس کے احکام

حیض کے لغوی معنی سیلان (بہنے) کے ہیں، اور شریعت کی اصطلاح میں حیض اس خون کو کہتے ہیں جو اندرون رحم سے مخصوص اوقات میں خارج ہوتا ہے، حیض کا خروج عورت کے لیے ایک طبعی اور فطری امر ہے، اس کا خروج بلوغ سے شروع ہوتا ہے اور بڑی عمر تک جاری رہتا ہے، بلوغ نو سال کی عمر سے شروع ہوسکتا ہے، اس سے پہلے نہیں ہوسکتا، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ نو سال مکمل ہونے کے کچھ سال بعد بلوغ ہو، اس کا انحصار آب و ہوا اور غذا وغیرہ جیسی خارجی چیزوں پر ہوتا ہے، بڑی عمر کی مدت احناف کے یہاں ۵۵ رسال ہے۔

حیض کی مدت: حیض کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ مدت احناف کے نزدیک متعین ہے، اس کی کم سے کم مدت تین دن ہے، اگر تین دن سے کم خون آئے تو یہ حیض کا خون نہیں سمجھا جائے گا، اور اس سے حیض کے احکام متعلق نہیں ہوں گے، اسی طرح حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے، اگر اس کے بعد بھی خون جاری رہے تو یہ حیض کا خون نہیں ہوگا اور اس سے حیض کے احکام متعلق نہیں ہوں گے، چنانچہ دار قطنی نے حضرت ابو امامہ باہلیؓ کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ کی روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''باکرہ اور ثیبہ دونوں کی اقل مدت حیض تین دن ہے اور اکثر مدت حیض دس دن ہے، اور جو خون دس سن سے بڑھ جائے وہ استحاضہ کا خون ہے''۔ اسی کے ہم معنی روایت حضرت واثلہ ابن اسقعؓ کی بھی ہے۔

طہر کی مدت: دو حیضوں کے درمیان پاکی کی زیادہ سے زیادہ مدت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، جب تک خون نہ آئے عورت پاک رہے گی، لیکن اس پاکی کی کم سے کم مدت پندرہ دن متعین ہے، اس مدت کا پورا ہونا ضروری ہے، اگر کسی عورت کو ایک حیض کے بعد پندرہ دن پورے ہونے سے پہلے خون آنے لگے تو اسے حیض نہیں مانا جائے گا نہ ہی اس سے حیض کے احکام متعلق ہوں گے۔

حیض کے احکام: حیض سے کئی احکام متعلق ہیں، ذیل میں اس کی کچھ تفصیل درج کی جاتی ہے:

۱- حائضہ عورت کے لیے نماز پڑھنا روزہ رکھنا حرام ہے، اگر وہ نماز پڑھ لے یا روزہ رکھ لے تو شرعاً اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ وہ شریعت کی خلاف ورزی کرنے کے سبب گنہگار ہوگی، چنانچہ بخاری کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت حبیشؓ سے فرمایا: ''جب حیض آجائے تو نماز چھوڑ دو''۔ اسی طرح بخاری کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: کیا یہ نہیں ہے کہ جب عورت کو حیض آجاتا ہے تو وہ نماز روزہ نہیں کرتی۔

پھر جب حیض کا زمانہ ختم ہوجائے تو عورت روزوں کی قضا کرے گی، نماز کی قضا نہیں کرے گی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایام حیض میں فوت شدہ نمازوں کو عورت سے معاف کردیا ہے، چنانچہ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں: ''آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ہمیں حیض آجاتا تھا تو ہمیں روزوں کی قضا کا حکم دیا جاتا تھا، نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا''۔

۲:- حائضہ کے شوہر پر زن وشو کے مخصوص تعلق کا قائم کرنا حرام ہے یہاں تک کہ اس کا حیض منقطع ہوجائے اور غسل کرلے، اس کے بارے میں صراحت خود قرآن مجید میں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ الآية﴾ (سورۃ البقرۃ/۲۲۲) (وہ لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے

ہیں، فرمادیجیے کہ وہ گندگی ہے، لہٰذا تم لوگ حیض کے وقت عورتوں سے الگ رہو، اور جب تک پاک نہ ہوجائیں ان کے نزدیک نہ ہو، پھر جب خوب پاک ہوجائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے، بے شک اللہ کو توبہ کرنے والے پسند آتے ہیں، اور گندگی سے بچنے والے پسند آتے ہیں۔)

آیت میں الگ رہنے کے حکم کا مطلب خاص تعلق ختم کردینا ہے، اور خوب پاک ہوجانے کا مطلب غسل کرلینا ہے۔

۳:- اس حالت میں مخصوص تعلق حرام ہے، لیکن ناف اور اس کے اوپر کے اعضاء سے لطف اندوز ہونا درست ہے، اسی طرح گھٹنے کے نیچے والے اعضاء سے بھی، ان اعضاء سے لطف اندوز ہونے کے لیے کسی حائل کا ہونا بھی شرط نہیں ہے، البتہ ناف اور گھٹنے کے درمیانی اعضاء سے لطف اندوز ہونا اسی وقت درست ہے جب کہ درمیان میں کپڑا موجود ہو اور اور خاص تعلق قائم نہ کرے، لیکن احتیاط یہی ہے کہ ایسا نہ کرے، ورنہ حدود سے تجاوز کا خطرہ ہے، یہ احکام مختلف احادیث سے ماخوذ ہیں، چنانچہ مسلم کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عورتوں سے حالت حیض میں جماع کے علاوہ ہر چیز کرلیا کرو۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا حکم تھا کہ جب کوئی عورت حیض کی حالت میں ہو تو ازار کو اچھی طرح باندھ لے پھر اس کا شوہر ساتھ میں لیٹ سکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ازواج مطہرات میں سے کسی سے حیض کی حالت میں اس طرح ملتے تھے کہ نصف گھٹنوں تک چادر پڑی ہوتی تھی۔

۴:- حائضہ کے لیے طواف کعبہ منع ہے، چنانچہ بخاری کی روایت میں آنحضرت ﷺ سے اس کی ممانعت ثابت ہے۔

۵:- حائضہ کے لیے قرآن کریم کی تلاوت جائز نہیں ہے، نہ قرآن دیکھ کر نہ زبانی، چنانچہ ترمذی کی روایت ہے: حائضہ اور جنبی قرآن کا کچھ بھی نہیں پڑھیں گے۔ البتہ علامہ حصکفی فرماتے ہیں کہ اگر قرآن کی آیت دعا کی نیت سے یا حمد کے لیے یا تعلیم دینے کے لیے پڑھے اور ایک ایک لفظ کو الگ الگ کرے تو صحیح قول کے مطابق جائز ہے۔

۶:- اگر کوئی عورت معلّمہ ہے تو وہ حیض کی حالت میں قرآن اور تفسیر وغیرہ پڑھا سکتی ہے، لیکن قرآن پڑھتے وقت ایک بار پوری آیت نہیں پڑھے گی، بلکہ ایک ایک لفظ کو الگ الگ کرکے پڑھے گی، اسی طرح قرآن مجید کو کسی حائل کے بغیر نہیں پکڑے گی، ہاں غلاف کے ساتھ مس کرے یا غلاف میں رکھے ہوئے قران کو چھوئے تو جائز ہے، چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: قرآن کو صرف پاکی کی حالت میں مس کریں۔

۷:- حائضہ کے لیے مسجد میں جانا یا بیٹھنا منع ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: میں کسی حائضہ یا جنبی کے لیے مسجد کو جائز نہیں کرتا۔

۸:- حالت حیض میں عورتوں کو طلاق دینا حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾ (سورۃ الطلاق/۱) تفسیر ابن کثیر میں اس کا مطلب یہی بیان کیا گیا ہے کہ عورتوں کو ایسے طہر میں طلاق دی جائے جس میں ان سے جماع نہ کیا گیا ہو۔

۹:- حیض ختم ہونے کے بعد غسل کرنا فرض ہے، اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے اور احادیث میں بھی ہے۔

۱۰:- اگر حیض ایسے وقت میں ختم ہوا جب کہ نماز کا آخری وقت ہے تو اس صورت میں اگر اس کی کوئی عادت ہے، یا دس دن سے کم میں حیض کا خون بند ہوا ہے، اور اتنا وقت باقی ہے کہ وہ غسل کرکے تحریمہ باندھ سکے، تو اس پر اس وقت کی نماز فرض ہے، اور نہ ادا کرنے کی صورت میں اس کی قضا ضروری ہے۔

اور اگر دس دن کے بعد خون بند ہوا ہے تو خواہ غسل اور تحریمہ کے لیے وقت باقی ہو یا نہ ہو، یہ نماز واجب ہوجائے گی اور اس کی قضا کرنا ضروری ہوگا، اس لیے کہ بخاری و مسلم میں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جو نماز کی ایک رکعت پالے اس نے نماز (کا وقت) پالیا۔

۱۱:- اگر کسی فرض نماز کا وقت ہوگیا، کسی عورت نے ابھی یہ نماز نہیں پڑھی تھی کہ اسے خون جاری ہوگیا تو یہ نماز اس سے ساقط ہوجائے گی، خواہ ایسا نماز کے آخری وقت ہی میں کیوں نہ ہوا ہو۔ (ہندیہ ۱/۳۸)

۱۲:- اگر رمضان میں فجر سے پہلے خون بند ہوگیا تو عورت روزہ شروع کردے گی، اگرچہ اس نے ابھی غسل نہ کیا ہو، اس لیے کہ اس مدت میں روزہ رکھنے کی ممانعت ناپاکی کے خروج کی وجہ سے ہے، اور جب یہ سلسلہ ختم ہوگیا تو اس کے بعد کا روزہ رکھنا ضروری ہوگیا، خواہ عورت غسل سے فارغ ہوئی ہو یا نہیں۔

۱۳:- اوپر گزر چکا ہے کہ حالت حیض میں مخصوص تعلق کرنا حرام ہے، لیکن اگر کوئی اس کا ارتکاب کر بیٹھے تو اسے توبہ استغفار کرنا چاہیے، اور مستحب یہ ہے کہ کچھ صدقہ کردے، اس لیے کہ ترمذی کی روایت ہے کہ جب مرد عورت سے حالت حیض میں مخصوص تعلق قائم کرے تو اگر لال خون آرہا ہو تو ایک دینار اور پیلا آرہا ہو تو نصف دینار صدقہ کرے۔

۱۴:- اگر حمل کے دوران خون جاری ہوجائے یا ولادت سے پہلے خون آجائے تو اسے نہ نفاس کا خون قرار دیا جائے گا نہ حیض کا، بلکہ یہ دم استحاضہ ہوگا۔

نفاس: نفاس اس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورت کے رحم سے نکلتا ہے، اس کی کم سے کم مدت مقرر نہیں ہے، ایک لمحہ بھی خون آجائے تو وہ نفاس کا مانا جائے گا، اور جیسے ہی بند ہوجائے عورت پاک مانی جائے گی، البتہ اس کی اکثر مدت چالیس دن مقرر ہے، چنانچہ ترمذی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نفاس والی عورتیں چالیس دن بیٹھتی تھیں۔

اگر کسی عورت کو چالیس دن سے زیادہ خون آجائے تو اسے دم استحاضہ مانا جائے گا، اگر بچہ ناقص الخلقت پیدا ہو یا وقت سے پہلے حمل ساقط ہوجائے تو اگر کچھ اعضاء بن گئے ہوں تو نفاس کا حکم جاری ہوگا، اگر صرف گوشت کا لوتھڑا ہو جس میں خلقت کے کوئی آثار نہ ہوں تو اس کے بعد آنے والے خون کو نفاس نہیں مانا جائے گا، بلکہ اسے استحاضہ یا حیض قرار دیا جائے گا۔

اگر جڑواں بچے پیدا ہوں تو نفاس کا حکم پہلے بچہ کی ولادت ہی سے جاری ہوجائے گا، لیکن جڑواں بچہ اسی وقت مانا جاتا ہے جب دونوں کے درمیان چھ مہینے سے کم کی مدت ہو۔

نفاس کے احکام: نفاس کا خون بند ہونے کے بعد بھی غسل کرنا واجب ہے، اور اس میں بھی وہ تمام احکام جاری ہوتے ہیں جو پیچھے حیض کے بیان کیے گئے ہیں۔

استحاضہ: حیض کی اقل مدت تین دن سے کم یا اکثر مدت دس دن سے زیادہ یا نفاس کی اکثر مدت چالیس دن سے زیادہ آنے والے خون کو استحاضہ کہتے ہیں، اس خون سے حیض و نفاس کے احکام متعلق نہیں ہوتے ہیں، پاک عورتوں کی طرح وہ نماز روزہ کرتی رہے گی، چنانچہ حضرت فاطمہ بنت حبیش آنحضرت ﷺ کے پاس آئیں اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں مستحاضہ عورت ہوں، پاک نہیں رہتی ہوں، تو کیا نماز چھوڑ دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، وہ رگ کا خون ہے، حیض نہیں ہے۔

مستحاضہ کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ ہر نماز کا وقت شروع ہونے کے بعد وضو کرلے، پھر دوسرے وقت کے لیے دوبارہ وضو کرے، چنانچہ ترمذی کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مستحاضہ عورت ایام حیض میں نماز چھوڑ دے گی، پھر غسل کرے گی اور ہر نماز کے لیے وضو کرے گی، اور روزہ نماز کرے گی۔

معلوم ہوا کہ مستحاضہ پاک عورتوں کی طرح تمام امور انجام دے سکتی ہے، اور شوہر اس سے خاص تعلق بھی قائم کرسکتا ہے۔

جناب منصور الحق (کراچی)

دین اسلام میں استاد کی عظمت

حضرت سیدنا علیؓ نے فرمایا: ''جس نے مجھے ایک حرف بھی بتایا میں اس کا غلام ہوں، وہ چاہے مجھے بیچے، آزاد کرے یا غلام بنائے رکھے''۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا مجھے اس جہاں میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ کہہ کر حضور ﷺ کی شان بحیثیت معلم بیان کی ہے، خود رسالت مآب ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ''میں استاد بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ اسلامی نظام تعلیم میں استاد کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ معلم کی ذات ہی علم ارتقاء سے وابستہ ہے۔ نئی نسل کے مستقبل کی تعمیر کے سلسلے میں استاد کی مثال ایک کسان اور باغبان کی سی ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ کے یہ الفاظ معلم کی عظمت و اہمیت کے عکاس ہیں۔ ''استاد دراصل قوم کے محافظ ہیں کیوں کہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہیں کے سپرد ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجہ کی محنت اور کارگزاریوں میں سے سب سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری ملک کے معلموں کی کارگزاری ہے۔ معلم کا فرض سب فرائض سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیونکہ تمام قسم کے اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلیدی اس کے ہاتھ میں ہے اور ہر قسم کی ترقی کا سرچشمہ اس کی محنت ہے۔''

ہنری (Henry) کا کہنا ہے ''معلم فروغ علم کا ذریعہ ہے لیکن اس کے علم سے فائدہ وہ نیک بخت اٹھاتے ہیں جن کے سینے ادب و احترام کی نعمت سے مالا مال ہوں کیونکہ ادب ایک درخت ہے اور علم اس کا پھل۔ اگر درخت ہی نہ ہو تو پھل کیسے لگے گا؟''

اب ملت اسلامیہ کی قابل قدر، قد آور چند شخصیات کے احوال و اقوال کا ذکر کیا جاتا ہے جنہوں نے اپنے اساتذہ کے ادب و احترام کی درخشندہ مثالیں قائم کیں اور جو ہمارے لیے مشعل راہ بھی ہیں:

خلیفہ چہارم امیر المومنین حضرت سیدنا علیؓ نے فرمایا: ''جس نے مجھے ایک حرف بھی بتایا میں اس کا غلام ہوں، وہ چاہے مجھے بیچے، آزاد کرے یا غلام بنائے رکھے''۔ ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ ''عالم کا حق یہ ہے کہ اس کے آگے نہ بیٹھو اور ضرورت پیش آئے تو سب سے پہلے اس کی خدمت کے لیے کھڑے ہو جاؤ''۔ مفسر قرآن حضرت سیدنا عبد اللہ ابن عباسؓ معارف قرآن کے لیے حضرت ابی بن کعبؓ کے گھر جاتے تو ان کے دروازے پر دستک نہ دیتے بلکہ خاموشی سے ان کا انتظار کرتے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے معمول کے مطابق باہر آتے۔ حضرت ابی بن کعبؓ کو یہ بات گراں گذری۔ ایک دن کہنے لگے ''آپ نے دروازہ کیوں نہ کھٹکھٹایا تا کہ میں باہر آجاتا اور آپ کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی''۔ آپ نے جواب میں کہا ''عالم کا اپنی قوم میں مقام ایسا ہی ہے جیسے نبی ﷺ کا مقام امت میں اور بے شک اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے ادب کے بارے میں فرمایا (اے دروازہ نبوت پر آوازیں لگانے والو) اگر تم صبر کرتے یہاں تک کہ میرے رسول خود باہر تشریف لاتے''۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی۔ پھر ان کی سواری کے لیے خچر لایا گیا تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے آگے بڑھ کر رکاب تھام لی۔ حضرت زیدؓ نے کہا۔ اے ابن عم رسول اللہ! آپ ہٹ جائیں، اس پر حضرت ابن عباسؓ نے جواب دیا ''علماء اور اکابر کی عزت اسی طرح کرنی چاہیے''۔ امام اعظم سیدنا ابو حنیفہؒ اور آپ کے استاد امام حماد بن سلیمانؒ کے گھر کے درمیان سات گلیوں کا فاصلہ تھا۔ لیکن آپ کبھی ان کے گھر کی طرف پاؤں کر کے نہیں سوئے۔ آپ دوران درس اپنے استاد کے بیٹے کے احترام میں کھڑے ہو

جایا کرتے تھے۔ امام حمادؒ کی ہمشیرہ عاتکہ کہتی تھیں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ ہمارے گھر کی روئی دھنتے، دودھ اور ترکاری خرید کر لاتے اور اس طرح کے بہت سے کام کرتے تھے۔

امام احمدؒ ایک بار مرض کی وجہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، اثنائے گفتگو ابراہیم بن طہمانؒ کا ذکر نکل آیا۔ ان کا نام سنتے ہی آپ فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ یہ بات نازیبا ہوگئی کہ نیک لوگوں کا ذکر ہو اور ہم اس طرح بیٹھے رہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ کی مجلس درس بڑی با وقار ہوتی تھی، تمام طلبہ مؤدب بیٹھتے، یہاں تک کہ ہم لوگ کتاب کا ورق آہستہ الٹتے کہ کھڑ کھڑاہٹ کی آواز پیدا نہ ہو۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے نماز پڑھی ہو اور اپنے استاد سیدنا امام ابوحنیفہؒ کے لیے دعا نہ مانگی ہو۔ ایک روایت ہے کہ آپ ہر نماز کے بعد پہلے امام اعظمؒ کے لیے دعاء مغفرت کرتے تھے پھر اپنے والدین کے لیے۔

آپ فرماتے مجھے اپنے استاد حضرت امام شافعیؒ کے سامنے کبھی پانی پینے کی جرأت نہیں ہوئی۔

ہارون الرشید کے دربار میں کوئی عالم تشریف لاتے تو بادشاہ ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ درباریوں نے کہا کہ اس طرح سلطنت کا رعب جاتا رہتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ اگر علماء دین کی تعظیم سے رعب سلطنت جاتا ہے تو جانے ہی کے قابل ہے۔

ایک دفعہ ہارون الرشید نے ایک نابینا عالم کی دعوت کی اور خود ان کے ہاتھ دھلانے لگا۔ اس دوران میں عالم صاحب سے پوچھا، آپ کو معلوم ہے کہ کون آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہا ہے۔ عالم نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر ہارون الرشید نے جواب دیا میں نے یہ خدمت خود انجام دی ہے۔ اس پر عالم دین نے کسی ممنونیت کا اظہار نہیں کیا بلکہ جواب دیا کہ ہاں آپ نے علم کی عزت کے لیے ایسا کیا ہے۔ اس نے جواب دیا بے شک یہی بات ہے۔

ہارون الرشید نے اپنے بیٹے مامون کو علم و ادب کی تعظیم کے لیے امام اصمعی کے سپرد کر دیا تھا۔ ایک دن ہارون اتفاقاً اس کے پاس جا پہنچا دیکھا کہ اصمعی اپنے پاؤں دھو رہے ہیں اور شہزادہ پاؤں پر پانی ڈال رہا ہے۔ ہارون الرشید نے برہمی سے کہا: میں نے تو اسے آپ کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ آپ اس کو ادب سکھائیں گے آپ نے شہزادے کو یہ حکم کیوں نہیں دیا کہ ایک ہاتھ سے پانی ڈالے اور دوسرے ہاتھ سے آپ کے پاؤں دھوئے۔

حضرت یوسف بن حسینؒ کا قول ہے کہ ادب سے علم سمجھ میں آتا ہے اور علم سے عمل کی تصحیح ہوتی ہے اور عمل سے حکمت حاصل ہوتی ہے۔ (آداب المعلمین ص: ۱۰)

اصمعیؒ کا قول مشہور ہے: جو شخص علم حاصل کرنے میں ایک لمحہ کی ذلت برداشت نہ کر سکے وہ پھر ساری عمر جہالت کی ذلت میں زندگی گزار دیتا ہے۔

مولوی سید میر حسن اقبال کے اساتذہ میں وہ باکمال شخصیت ہیں جنہوں نے آپ کی تربیت میں یادگار کردار ادا کیا، جب اقبال کو "سر" کا خطاب دیا جانے لگا تو آپ نے کہا کہ پہلے میرے استاد سید میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے تب میں یہ خطاب قبول کروں گا۔ اسی طرح بیماری کے دنوں میں ڈاکٹروں کے بے حد اصرار کے باوجود آپ نے اپنے استاد محترم کے کہنے پر گردے کا آپریشن نہیں کروایا۔ ایک دفعہ اقبال اپنے چند دوستوں کے ہمراہ گلی میں بیٹھے تھے کہ اچانک انہوں نے دور سے مولوی صاحب کو آتے دیکھا تو جلدی سے ان کے پاس پہنچے، اس حالت میں کہ ان کے ایک پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔ اقبال ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے حتیٰ کہ مولوی صاحب کو ان کے گھر پہنچا کر واپس آئے۔ علامہ اقبال نے ایک بار کہا تھا کہ یورپ کا کوئی عالم یا فلسفی ایسا نہیں جس سے میں نہ ملا اور کسی نہ کسی موضوع پر بلا جھجک بات نہ کی ہو لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ شاہ جی (مولوی سید میر حسن) سے بات کرتے ہوئے میری قوت گویائی جواب دے جاتی ہے۔ بہر کیف خلاصہ کلام یہ ہے کہ دین اسلام میں استاد کو جو بلند مقام حاصل ہے دیگر مذاہب میں اس کا تصور بھی محال ہے۔

محمود حسن حسنی ندوی

ایک سلطان کی غریب پروری

جن اسلامی شخصیات کی ہم تاریخ پڑھتے ہیں، خواہ وہ حکام ہوں یا قاضی، امراء ہوں یا سپہ سالار وغیرہ وغیرہ، زیادہ تر ان کے جو کارنامے ہمارے سامنے آتے ہیں، وہ یا تو ان کی مدت حکومت کے بارے میں ہوتے ہیں یا ان کے جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں، یا اللہ کے دین کی نصرت وخدمت میں ان کی کوششوں اور قربانیوں کے بارے میں ہوتے ہیں، اور بسا اوقات ان کی تصانیف کا تذکرہ ہوتا ہے، اگر وہ لکھنے کا ذوق رکھتے ہیں، یا ان روایات کے متعلق معلومات ہوتی ہیں جو ان کے سلسلہ میں مشہور ہوئیں۔

لیکن ذاتی سیرت واخلاق اور نجی زندگی کے تقویٰ اور انابت الی اللہ کے احساسات اور فقراء ومساکین سے محبت اور ان کی خدمت، اور محض اللہ کے لیے انجام دیئے ہوئے اعمال، ظاہری کمالات میں دب کر رہ جاتے ہیں اور مؤخرین ان کو نمایاں نہیں کرتے۔

تاریخ کے گہرے مطالعہ کے دوران بعض بڑے فاتحین، شہنشاہ اور قائدین کے ظاہری کمالات اور فضائل کے درمیان ایسے چھوٹے واقعات ملتے ہیں جو ان کی زندگی سے متعلق ہیں اور بڑے سبق آموز ہیں۔

ان ہی میں سے ایک واقعہ ''ابوالمسک کافور اخشیدی'' کا ہے جو فاطمیوں سے پہلے مصر کا حاکم تھا اور اس کے زیر انتظام مصر اور اطراف مصر کا بڑا علاقہ تھا، قارئین میں کم ہی ایسے لوگ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ ''کافور اخشیدی'' نجی زندگی میں بڑا متقی اور اللہ کا خوف رکھنے والا تھا، اور غرباء مساکین کی فکر کرنے والا تھا، اس کا معمول تھا کہ عید کی رات کو قاہرہ میں تمام حاجت مندوں کو خاموشی کے ساتھ اتنا تقسیم کرتا جو ان کے عید منانے کے لیے کافی ہوسکے۔

اس کے بے نظیر واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے جسے ان کے خزانچی ''ابوبکر معلیٰ'' نے بیان کیا ہے، کہ ''وہ ہر عید کے موقع پر ان کو غریب علاقوں میں بھیجا کرتا تھا، ان کے ساتھ قاہرہ کے حاجت مندوں کا رجسٹر ہوتا جس میں ان لوگوں کے نام اور پتے درج ہوتے اور ایک محافظ بھی ہوتا، اور رہبر بھی، جو ایسے گھروں کو بخوبی جانتا ہو، یہ ہر اس گھر پہنچتے جس کا رجسٹر مین ذکر ہوتا، اور گھر والے سے کہتے: ابوالمسک کافور نے آپ کو عید کی مبارکباد کا پیغام بھیجا ہے اور کہا ہے: ''اپنا عید کا خرچ اس رقم سے چلائیے''۔

ایک موقع پر ابوبکر نے اس رجسٹر مین ایک نئے نام کا اضافہ پایا، وہ نام ''عبداللہ بن جابار'' کا تھا، جن کو قاہرہ آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، ابوبکر معلیٰ کہتے ہیں کہ وہ اس گھر پہنچے تو وہاں سے ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس پر بے خوابی کے اثرات تھے۔

ابوبکر نے کہا: ابوالمسک کافور نے آپ کو عید کی مبارکباد کا پیغام بھیجا ہے۔

اس شخص نے کہا: اللہ خوب جانتا ہے کہ شاہ کے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا گو رہتا ہوں، اس اللہ سے جو سننے والا اور قبول کرنے والا ہے۔

ابوبکر نے کہا: اس نے آپ سے کہا ہے، اپنا عید کا نفقہ اس سے چلائیے اور (یہ کہتے ہوئے ابوبکر نے) ان کی طرف سو (۱۰۰) دینار بڑھائے، ابن جابار نے لینے سے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا: ہماری اس سے محبت کو کسی دنیوی فائدے سے ملوث نہ کیجیے، اس کو اللہ کے لیے رہنے دیجیے۔ ابوبکر نے بڑی کوشش کی کہ وہ اس کو قبول کرلیں لیکن انہوں نے ان کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار دیکھے، تو وہ خاموش ہوگئے، کافور کے پاس پہنچ کر تفصیلات بیان بتائیں اور کہا، اللہ آپ کے لیے ہر دعا کو جو آپ کے لیے کی گئی قبول کرے۔

کافور نے کہا: ساری تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے مجھ کو اپنے بندوں کو راحت پہنچانے کا ذریعہ بنایا۔

ابوبکر نے کچھ دیر کے بعد کافور کو ''ابن جابار'' کا قصہ سنایا، تو کافور نے کہا: عبداللہ دنیادار لوگوں میں نہیں ہیں، لیکن تم اس کے پاس پھر جاؤ، جب وہ تم سے کہیں، کیا تم ہمارے پاس نہیں آئے

تھے، تو تم سورہ طٰہٰ کی آیتیں تلاوت کرنا: ﴿ طٰهٰ ☆ مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى ☆ إِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَن يَخْشَى ☆ تَنزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمٰوَاتِ الْعُلَى ☆ الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ☆ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَى ﴾ پھر کہنا کافور نے آپ سے کہا ہے میں کون ہوں؟ حبشی غلام کافور کیا چیز ہے؟ بلکہ یہ ساری مخلوق کیا ہے؟ کیا اللہ کی ملکیت سے کوئی بچا ہے؟ یہ دینے والا کون ہے؟ اور کس کے دیئے کو آپ لوٹا رہے ہیں، آپ نے جس سے مانگا تھا وہی آپ کو دے رہا ہے۔

ابوبکر بیان کرتے ہین: میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، وہ میرے قریب آئے اور مجھ سے وہی سب کچھ کہا جس کی کافور کو امید تھی، تو میں نے کچھ اور نہیں کہا، صرف ان آیات قرآنیہ کو پڑھا، اور کافور کا پیغام سنایا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اور دیر تک گریہ کی کیفیت طاری رہی میں خاموش یہ منظر دیکھتا رہا، کچھ دیر کے بعد آنسو تھمے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں کو بڑھاتے ہوئے انہوں نے کہا: کہاں ہے جو کچھ تمہارے پاس ہے، میں نے کافور کی دی ہوئی رقم بڑھادی، عبداللہ بن جابار نے کہا: کافور نے ہم کو تہذیب نفس کے سبق سکھادیئے۔

ابوبکر پھر کافور کے پاس لوٹے اور یہ واقعہ سنایا، تو وہ اللہ کا شکر بجالاتے ہوئے کافور سر بسجود ہوگیا اور کہا: سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے اپنے بندوں کو رحمت پہنچنے کا ذریعہ بنایا، پھر وہ عید کی نماز کے لیے روانہ ہوگیا، کافور نے نماز کو جانے کے لیے اپنی سواری اس وجہ سے مؤخر کردی تھی کہ یہ جانتے کہ ابن جابار نے کیا جواب دیا۔

ہم ملاحظہ کریں کہ ابوبکر کی مہم جو عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوئی تھی باوجود رات کے دراز ہونے کے صبح کو چاشت کے وقت تکمیل کو پہنچی۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء و أجزل ثوابہ

حدیث نبوی شریف: "من أراد أن تستجاب دعوته و تفرج كربته فيفرج عن معسر" (جو چاہتا ہے کہ اس کی دعا قبول ہو اور اس کی پریشانی دور ہو وہ کسی پریشان حال کی پریشانی کو دور کرے) (رواہ إبن أبي الدنيا)

بقیہ: اخلاص کے بغیر علم بے سود ہے

.....اور نہ جانے کتنے لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، یہ بات امام ابن تیمیہؒ نے لکھی ہے جو خود تصنیفات کے امام ہیں اور غیر معمولی ان کی تصنیفات ہیں، لیکن یہ وہ حضرات ہیں جو کچھ بھی لکھتے تھے اللہ کے لیے لکھتے تھے، اسی لیے ایسے لوگوں کی کتابیں باقی رہتی ہیں جن سے فائدہ ہوتا رہتا ہے اور جن سے فائدہ نہیں ہے وہ کتابیں چھپتی ہیں اور اس کے بعد چھپتی ہیں یعنی وہ باقی نہیں رہتی ہیں، چاہے وہ کہیں سے پیسہ لاکر چھاپ لی ہوں، چاہے دس ہزار چھاپیں، چاہے بیس ہزار چھاپیں، لیکن اس سے فائدہ ذرہ برابر نہیں ہوتا، لیکن جن سے اللہ تعالیٰ کو فائدہ پہنچانا رہتا ہے، اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے، اس لیے اس بات کا خیال بہت ضروری ہے کہ خدانہ خواستہ ہمارے علم سے نفع تو دور کی بات ہے ہم کو نقصان نہ پہنچ جائے اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچے۔

اس لیے کہا گیا ہے کہ کوئی علم اس لیے حاصل کررہا ہے کہ لوگوں میں شہرت حاصل کرے، علامہ اور مولانا کہا جائے، تو ظاہر ہے کہ اس شخص کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا، ہم سب کو اس سے ڈرنا چاہیے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ وہ مجاہد جو اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر خود کو جوکھم میں ڈال کر بڑے بڑے معرکہ سر کررہا ہے تاکہ وہ بڑا مجاہد اور بہادر کہا جائے تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا، کتنے ہی بڑے بڑے کام ہوں، سخاوت کا کام ہو یا جہاد کا معاملہ ہو یا علم کا معاملہ ہو، یہ سب اگر اللہ کے لیے ہے تو اللہ کے یہاں قبول ہے ورنہ قابل قبول نہیں ہے، جب اتنے بڑے بڑے لوگوں کا حال یہ ہے تو ہمہ شمہ تو درکنار، یعنی ہم لوگ جو کام کررہے ہیں، اگر ہماری بھی اس میں نیت درست نہیں ہوئی تو ہمارا انجام کیا ہوگا؟! اس لیے ہم لوگ جو کام بھی کریں اس میں اپنی نیت درست کرلیں، کہ ہمارا خدا ہم سے راضی ہوجائے۔

آپ کے دینی سوالات اور ان کے جوابات

(آپ اپنے دینی سوالات ہماری ویب سائٹ پر بھی پوچھ سکتے ہیں) www.abulhasanalinadwi.org

وسیلہ

سوال: بدعتی اکثر یہ بحث کرتے ہیں کہ اولیائے کرام سے مراد مانگنا ان سے مدد مانگنا نہیں ہوتا بلکہ ان کا وسیلہ اختیار کرنا ہوتا ہے، اور اللہ کی مدد کے لیے وسیلہ ضروری ہے۔ کیا یہ صحیح بات ہے؟ (سعید احمد، مریشیس)

جواب: اللہ سے مانگنے کے لیے وسیلہ قطعاً ضروری نہیں ہے، اللہ خود فرماتا ہے ﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي﴾ (میں مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے مانگتا ہے، تو بندوں کو چاہیے کہ وہ مجھ سے مانگیں)۔ اگر کوئی شخص کسی ولی یا نبی سے دور رہ کر یا قبر پر جا کر خطاب کر کے کہتا ہے کہ میرا فلاں کام کر دیجیے تو یہ شرک ہے۔

داڑھی کا شرعی حکم

سوال: داڑھی رکھنے کی لیے اسلام میں اللہ اور ان کے رسول ﷺ نے کیا فرمایا ہے؟ (محمد عالمگیر، کلکتہ)

جواب: مردوں کے لیے داڑھی رکھنا واجب ہے، اس کی مقدار شرعی ایک مشت ہے، داڑھی انبیاء کرام کی متفقہ سنت ہے، اسلامی اور ملی شعار ہے، آپ ﷺ کا دائمی عمل ہے اور آپ ﷺ نے اسے فطرت ست تعبیر فرمایا ہے، آپ ﷺ نے اپنی امت کو داڑھی رکھنے کا تاکیدی حکم فرمایا، لہٰذا داڑھی رکھنا واجب اور ضروری ہے منڈوانا حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اس پر امت کا اجماع ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ دس چیزیں فطرت میں سے ہیں اس میں سے مونچھوں کا کتروانا، داڑھی کا بڑھانا بھی ہے۔

کرنٹ والی مشین سے مچھر مارنا

سوال: مچھر کی مشین جس سے مچھر کرنٹ سے مرتے ہیں، کیا اس کا استعمال جائز ہے؟ (طفیل اختر، نیپال)

جواب: مچھر مارے والی مشین جس سے کرنٹ لگنے سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں، اس کا استعمال مکروہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے کسی کو جلا کر مارنے سے منع فرمایا ہے، آگ سے جلانے کی سزا اللہ ہی کا حق ہے۔ البتہ آج کل مچھر کو مارنے کے لیے جو مختلف دوائیں استعمال کی جاتی ہیں ان کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

عشاء کی نماز کا وقت

سوال: عشاء کی نماز کا وقت مغرب کے کتنی دیر کے بعد شروع ہوتا ہے؟ (فواد الرحمٰن، جنیوا، سوئزرلینڈ)

جواب: مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت مختلف ملکوں میں مختلف ہوتا ہے کہیں کم کہیں زیادہ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد جب تک شفق یعنی روشنی باقی ہے مغرب کا وقت ہے اور جب روشنی بالکل ختم ہو جائے تو عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

سود کی رقم کا مصرف

سوال: کیا سود کا پیسہ اپنے غریب مسلمان رشتہ داروں کو دیا جا سکتا ہے؟ (محمد مدثر، بنگلور)

جواب: سود کی رقم اپنے غریب مسلمان رشتہ داروں کو دے سکتے ہیں، لیکن یہ خیال رہے کہ سود کی رقم ایک غلاظت ہے اس لیے ایسی گندی چیز میں مسلمانوں کو ملوث کرنا بہتر نہیں ہے۔ اس کے بدل کے طور پر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا نظام رکھا ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ ان کو زکوٰۃ کی رقم میں سے دیں، اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کی اپنے رشتہ داروں کی اپنی گاڑھی کمائی سے مدد کی جائے۔

عورتوں پر جمعہ کی نماز

سوال: کیا عورتوں کو جمعہ کی نماز پڑھنی چاہیے، ان کے لیے جمعہ میں کتنی رکعات ہوتی ہیں؟ (علی خان، فتحپور)

جواب: اسلام نے عورتوں پر جمعہ اور عیدین کی نماز فرض قرار نہ دے کر ان کے لیے سہولت اور آسانی پیدا کی ہے، اس لیے انھیں چاہیے کہ وہ گھر میں نماز پڑھیں اور جمعہ کے بجائے ظہر کی نماز ادا کریں۔

یہ برما ہے .....

محمد نفیس خان ندوی

برما یا میانمار- ایک ایسا ملک جہاں کی سرزمین اکثر مسلم خون سے رنگین رہتی ہے، جہاں کی فضا میں عورتوں کی سسکیاں صاف سنائی دیتی ہیں، جہاں کا ماحول بچوں کی چیخوں سے ہمیشہ بوجھل رہتا ہے، جہاں بوڑھوں کی آنکھیں آنسو بہاتے بہاتے خشک ہوچکی ہیں، جن کے کاندھیں لاش دھوتے دھوتے مفلوج ہوچکے ہیں، جہاں صبح کا سورج دیکھنے کے بعد رات کا چاند دیکھنا سب کا نصیب نہیں، جہاں کے مسلمان اپنی زمین کو چھوڑ بھی نہیں سکتے کیونکہ کوئی بھی ملک ان کو اپنی سرحد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا، کوئی ان کے آنسو پونچھنا تو دور کی بات ان آنسوؤں کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا، جہاں کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہوچکی ہے، نہ اپنی مرضی سے جی سکتے ہیں، نہ اپنی مرضی سے مرسکتے ہیں، زندگی موت سے بدتر اور موت تڑپ تڑپ کے جینے کا دوسرا نام ہے، جہاں مسلمانوں کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ مسلمان ہیں، صرف ایک رب کو پوجنے والے ہیں، اور شاید اسی لیے ان کی چیخیں دنیا کو سنائی نہیں دیتیں، ان کا بہتا ہوا خون میڈیا کو نظر نہیں آتا ہے، ان کی لاشوں کے انبار سے نہ سلامتی کونسل کو فرق پڑتا ہے نہ اقوام متحدہ کو، ان کی مظلومیت پر نہ کوئی تنظیم آواز اٹھاتی ہے نہ کوئی تحریک! شاید اسی لیے کہ وہ مسلمان ہیں، اسی لیے ایک مذہبی ملک ہونے کے باوجود اس ملک میں مذہب اسلام پر ہر طرح کی پابندی ہے۔

برما میں مسلمانوں کی آمد نویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی، یہ وہ وقت تھا جب اسلام کی کرنیں عرب سے نکل کر فارس، چین اور یورپ کی تاریکیوں کو چھانٹ رہی تھیں، اس وقت اسلام کی کرنوں نے برما کی سرزمین کو بھی منور کیا۔ برما سے متصل بیس ہزار مربع میل پر مشتمل ایک مسلم علاقہ ہے جسے ''اراکان'' کے نام سے جانا جاتا ہے، اس خطہ کا قدیم نام ''روہنگ'' ہے جس کی نسبت سے وہاں کے مسلمان ''روہنگیا'' کہلاتے ہیں۔ یہ صوبہ شمال میں چین سے اور شمال مشرق میں بنگلہ دیش سے ملتا ہے جو کہ ایک مسلم ملک ہے، حالیہ دنوں میں جب روہنگیا مسلمانوں کو بنگلہ دیش کی مدد کی سخت ضرورت تھی تو وہاں کی وزیر اعظم حسینہ واجد نے ان مسلمانوں کو پناہ دینے سے انکار کردیا اور اور اپنی سرحدوں کے بند کرنے کا بھی اعلان کردیا، **1784**ء میں روہنگ پر برما نے تسلط قائم کیا، اس کے بعد **1824**ء میں یہ علاقہ برطانوی سامراج کے زیر اقتدار آگیا، **48-1947**ء میں جب انگریزوں کا یہاں سے انخلاء ہوا تو برما حکومت نے دوبارہ روہنگ کو اپنے قبضہ میں لے لیا، دوسری جنگ عظیم میں روہنگ ایک اہم محاذ تھا، اس جنگ میں ایک بڑی تعداد موت کا شکار ہوئی، اور باقی لوگوں میں سے ایک جم غفیر نے یہاں سے ہجرت کی یا جبری انخلا پر مجبور ہوئے، تاہم اِس وقت ایک محتاط اندازہ کے مطابق روہنگ میں تقریباً **8** لاکھ مسلمان آباد ہیں، یہ مسلمان وہ ہیں جو برما کے قانون، ذات ومذہب کے اعتبار سے وہاں کے اصل باشندے ہیں، لیکن موجودہ وقت میں انھیں قانونی طور ملک کی شہریت بھی حاصل نہیں ہے، ان کے علاقے محدود کردیے گئے ہیں، شہری ترقیات میں ان کا کوئی دخل نہیں ہے۔ حکومت میں ملازمت اور تعلیم کے دروازے ان پر بند ہیں، اپنی آپ بیتی اور ظلم وستم کی داستاں وہ دنیا سے بیاں بھی نہیں کرسکتے، عالمی افق پر روہنگیا مسلمانوں کا شمار ایسے باشندوں میں ہوتا ہے جن کا اپنا کوئی مسکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان مسلمانوں کو اقوام متحدہ کی جانب سے دنیا کی سب سے پسماندہ اور استحصال شدہ اقلیت قرار دیا گیا ہے، اس کے علاوہ برما کا ہر فوجی ٹولہ منظم اور طویل المیعاد منصوبوں کے تحت گزشتہ چھ سات دہائیوں سے مسلمانوں کی دینی وثقافتی ارتداد کے لیے کوشاں ہے، تاہم مسلمانوں کو اپنے دین سے چمٹے رہنے میں ہی اپنی کامیابی کا یقین ہے، مدارس کا نظام موجود ہے اور دینی رہنمائی کے لیے صحیح علماء کی کاوشیں بھی ہیں، اور یہ دینی بیداری اور اسلامی حمیت ہی ہے کہ وہ آج اپنے مذہب پر قائم ہیں اگرچہ آئے دن قیامت صغریٰ برپا ہوتی ہے۔

روہنگیا میں مسلمانوں کا قتل عام کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ خون کی یہ ہولی گزشتہ ساٹھ سالوں سے کھیلی جارہی ہے، **1941**ء میں اراکان کے ضلع اکیاب میں بدھسٹوں نے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی، پھر **26** مارچ **1942**ء کو ارکان کے ضلع

ریکھائن میں بسنے والے روہنگیا مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا، جس کا سلسلہ تقریباً تین مہینوں تک چلتا رہا، مارچ سے لے کر جون تک ایک رپورٹ کے مطابق تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا گیا، جبکہ کئی لاکھ مسلمان بے گھر و بے آسرا ہو گئے۔ اس کے بعد ریکھائن میں دوسری بار 1950ء میں قیامت ٹوٹ پڑی، اور بڑے پیمانہ پر بربریت کا ننگا ناچ ناچا گیا، تیسری بار 1978ء میں فوجی حکومت نے خونیں آپریشن کی شروعات کی اور ایک لاکھ کے قریب مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، کئی لاکھ اپنے گھروں سے بے دخل کر دیے گئے، 1991ء میں چوتھی دفعہ پھر مسلمانوں کو تختۂ مشق بنایا گیا، ان کے خون سے اراکان کی سڑکیں سرخ ہو گئیں، لاشوں پر لاشیں بچھا دی گئیں، اور ایک بہت بڑی تعداد موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔ 15 مئی 2001ء کو بدھوں نے ایک بار پھر مسلمانوں کو نشانہ بنایا، گیارہ مسجدیں مسمار کر دیں، چار سو سے زائد گھروں کو آگ لگا دی، اور دو سو افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جن میں سے بیس افراد وہ تھے جو مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے، انھیں اس قدر پیٹا گیا کہ وہ جان کی بازی ہار گئے۔ بدھوں کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں کی مسجدوں کو مسمار کر دیا جائے جسے حکومت نے سارے عالمی قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے منظوری دیدی، جس کے نتیجہ میں متعدد مسجدیں زمیں بوس کر دی گئیں، بعض کو مقفل کر دیا گیا، مسلمان اپنے گھروں میں عبادت کرنے پر مجبور ہو گئے، اور ایک بڑی تعداد نے وہاں سے ہجرت کر لی، آج لاکھوں کی تعداد میں برمی مسلمان تھائی لینڈ اور بنگلہ دیش کی سرحدوں پر خیموں میں زندگی گزار رہے ہیں۔

روہنگیا میں حالیہ فسادات کی شروعات اپریل 2012ء میں ہوئی، اس کا سبب یہ تھا کہ ریکھائن کے بااثر بدھ بھکشوؤں کی دو لڑکیوں نے اسلام قبول کیا، ان کا یہ اقدام اپنے خاندان اور برادری کے بالکل خلاف تھا، اور ان وحشیوں کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا، چنانچہ انھیں ہر طرح سے ڈرایا دھمکایا گیا، اور اسلام چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، ان کا معاشرتی بائیکاٹ بھی کیا گیا لیکن ان کی ہر طرح کی زیادتیوں کے باجود ان لڑکیوں نے اسلام سے پھرنا گوارہ نہ کیا، ان کے اس انکار کی وجہ سے ان بھکشوؤں کے اندر اسلام کے خلاف نفرت کا جو لاوا پک رہا تھا وہ پھوٹ پڑا، اور مسلم نسل کشی کا منصوبہ تیار کیا گیا، پھر یہ افواہ پھیلائی گئی کہ مسلمانوں نے دو بدھسٹ لڑکیوں کی عصمت دری کے بعد انھیں قتل کر دیا، مسلمانوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کیا گیا، پوسٹر چھاپے گئے، پمفلٹ تقسیم کیے گئے، لوگوں کو مشتعل کر کے فسادات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، اور پھر 2 جون 2012ء کو رنگون میں گیارہ مسلمانوں کو ایک بس سے اتار کر ان کو قتل کر دیا گیا، اس بربریت پر جب مسلمانوں نے مظاہرہ کیا تو ان کی آواز کو دبانے کی پوری کوشش کی گئی، اور پھر فسادات کی ایک لہر چل پڑی۔ اس ردعمل میں برما کی فوج نے معاملہ کو رفع کرنے کے بجائے مظاہرین پر تشدد کا رویہ اختیار کیا، جس سے سیکڑوں مسلمان شہید ہوئے، ایک رپورٹ کے مطابق تقریباً 25 ہزار سے زائد مسلمان شہید کیے جا چکے ہیں، 500 سے زیادہ بستیاں نذر آتش کی جا چکی ہیں، ہزاروں نوجوان لاپتہ ہو چکے ہیں۔

برمی مسلمانوں کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں، اگر وہ عیسائی یا یہودی ہوتے یا کم از کم گوری چمڑی والے ہوتے تو ان فسادات کے نتیجہ میں پوری دنیا میں کہرام مچ جاتا، عالمی میڈیا آسمان سر پر اٹھا لیتا، نیٹو افواج امن عالم کا ڈھنکا پیٹتی ہوئی وہاں پہنچ جاتی، امریکی قیادت کے دورے ختم ہونے کا نام نہ لیتے، یورپی یونین فوراً سے پیشتر برما حکومت پر پابندیاں عائد کر دیتی، اقوام متحدہ حکومت کی پامالی کی قراردادیں منظور کرتا ہوا خزانوں کے منھ کھول دیتا، حقوق انسانی کی تنظیمیں حرکت میں آجاتیں اور ان کے نمائندے ایک ایک مظلوم کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں اتروا تے، اور ہالی وڈ اور بالی وڈ میں ان پر دستاویزی فلمیں اور ڈرامے تیار ہوتے اور عالمی ایوارڈ حاصل کیے جاتے۔ تف ہے سیکولرزم کے ان پیروکاروں پر جن کا قبلہ مغرب، جن کا خدا پیٹ اور جن کا مذہب پیٹ کے نیچے کی خواہشوں کے سوا کچھ نہیں، انھیں ہندستان کے کسی دور دراز علاقہ میں ایک پٹتی ہوئی عورت تو نظر آجاتی ہے لیکن نسلوں سے خون میں نہاتے ہوئے اور جمہوریت کے اس دور میں بنیادی انسانی حقوق تک سے محروم برمی مسلمان نظر نہیں آتے!! پوری دنیا پر یورپ کی غلامی کے بعد آزادی کا سورج طلوع ہوا لیکن برما کے مسلمان انگریزی غلامی سے نکل کر اس سے بدتر غلامی کے شکنجہ میں جکڑ گئے، لیکن ظلم کی رات کتنی ہی تاریک کیوں نہ ہو آخر اسے ختم ہونا ہے، کیونکہ حالات کبھی یکساں نہیں رہتے!

مناجات

بنا کر اپنا مرکز دل کو تو ایسا سما جائے
کہ تجھ کو پاکر یہ بے چین دل تسکین پاجائے

بسا ہو تو نہ جس کے دل میں دل بیکار بالکل
نہ ہوگر باغ گل تو وہ گلشن بیکار ہے

بہت بے لطف اور بے کیف گذری زندگی اتنی
کٹے اب تیری طاعت میں ہے باقی زندگی جتنی

اطاعت ہو شعار اپنا عبادت ذوق بن جائے
مرا ہر ہر قدم یا رب سراپا شوق بن جائے

جیوں تیری طلب میں اور مروں تیری محبت میں
یہ پوری زندگی گذرے الٰہی تیری مدحت میں

مجھے اتنی محبت دے بنوں تصویر الفت کی
سراپا شوق بن کر توڑ دوں زنجیر فرقت کی

یہ روح کنج قفس میں پھڑ پھڑائے اور مچل جائے
تجھی کو یاد کرتے کرتے میرا دم نکل جائے

میرے رب مہرباں ہو جا تجھے صدقہ کریمی کا
یہ کلفت پیش خیمہ ہو تیری ذرہ نوازی کا

ہوئے ہوں عمر میں جتنے گنہ سب معاف کردے تو
الٰہی ہر برائی سے مرا دل صاف کردے تو

گناہ آلود دل کو پاک کردے آب رحمت سے
مجھے خلعت ملے بخشش کی تری باب رحمت سے

تیری شفقت تو مادر اور پدر سے ہے کہیں زائد
نہ ہو میری پکڑ بالکل نہ ہو کوئی سزا عائد

بچا کر نفس وشیطاں سے مجھے اپنا ہی راغب کر
ہٹا کر دار فانی سے میرا دل اپنی جانب کر

رہے تسنیم ہر لحظہ تیرے ہی ذکر میں شاغل
تیری بندہ نوازی سے یہ درجہ اس کو ہو حاصل

محترمہ امۃ اللہ تسنیم
(ہمشیرہ مفکر اسلامؒ)

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Postal Reg. No.
RBL/NP - 09

VOLUME 4

SEPTEMBER 2012

ISSUE 06

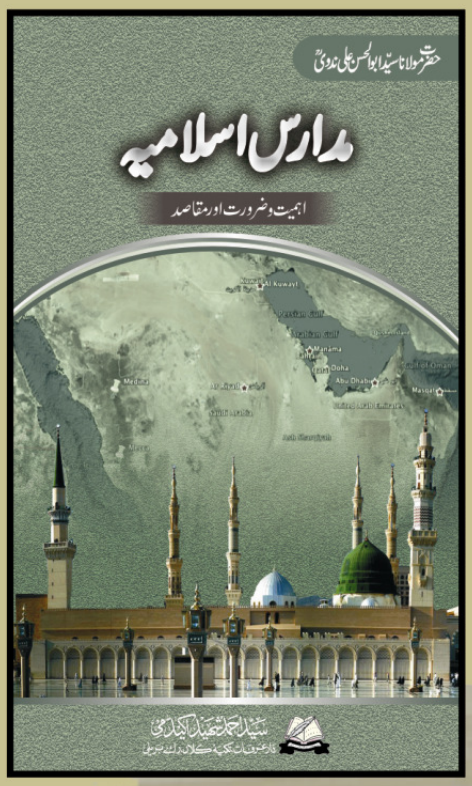

رابطہ کریں:
سید احمد شہید اکیڈمی
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی
Mob: 9918385097

Designed by Mohammad Makky Hasani Nadavi

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli, U.P.
Mobile: 9918385097, 9918818558
E-Mail: markazulimam@gmail.com
www.abulhasanalinadwi.org

Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi
On Behalf of: Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi
Printed at S.A. Offset Printers, Masjid ke peeche,Phatak
Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli, U.P.